یادگارِ حالی

انجمن ترقی اردو ہند
علی گڑھ

سلمان داود
القاهرة ١٩٥١م

یادگارِ حالی

یادگارِ حالی

تذکرہ خواجہ الطاف حسین حالی

صالحہ عابد حسین

پبلیشرز :-

انجمن ترقی اُردو ہند۔ علی گڑھ

قیمت للعہ

طباعت زیر اہتمام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی

جید پریس۔ دہلی

فہرست

تمہید

یادگارِ حالی لکھتے وقت باوجود تلاش کے مجھے کئی ایسی کتابیں دستیاب نہ ہو سکیں جن کی بہت ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ مولانا حالی کے ذاتی حالات جاننے والے یا تو خدا کو پیارے ہو چکے ہیں اور باقی زمانے کی گردش اور دیس کے بٹوارے کے ہاتھوں اپنے وطن سے بے وطن ہو کر ہندوستان اور پاکستان میں اس طرح بکھر گئے ہیں کہ اُن کی پھر شیرازہ بندی ہونا ناممکن نظر آتا ہے۔ میں نے اکثر ایسے بزرگوں کو جو مولانا حالی کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے، جن میں اُن کے عزیز، شاگرد، اور نیاز مند شامل تھے، خط لکھے کہ وہ حالی کی سوانح حیات لکھنے میں میری مدد کریں لیکن ان میں سے اکثر نے تو میرے خطوں کا جواب دینے کی تکلیف بھی گوارا نہیں فرمائی۔ دو ایک نے جواب دیا، ہمت افزائی بھی کی لیکن کوئی مدد نہ دے سکے یا دینی نہ چاہی۔ بہر حال جتنے حالات اور واقعات میں کتابوں سے، عزیزوں سے اور خود اپنی یادداشت سے، فراہم کر سکتی تھی ان کی بنا پر دو ڈھائی سال کی مسلسل محنت کے بعد، میں نے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ یہ میں جانتی ہوں کہ یہ کتاب دراصل کسی بڑے ادیب کو لکھنی چاہیئے تھی۔ میں چاہوں تو ایسے کئی بزرگوں کے نام بتا سکتی ہوں جو اس کام کو مجھ سے بہت بہتر کر سکتے ہیں اور جن پر اُردو زبان اور ادب کا اتنا حق ضرور ہے کہ وہ اس کے ایک رکنِ رکین کی زندگی اور ادبی کارناموں پر ایک مفصل اور معقول کتاب لکھیں۔ لیکن چونکہ انہوں نے اس کام کو نہیں کیا اس لئے میں نے فرضِ کفایہ

کے طور پر اس کو اپنے ذمہ لیا۔ اس خدمت کا سب سے بڑا محرک میری وہ پُرخلوص عقیدت ہے جو مجھے حالی سے ہے اور جو شاید (نقادوں کی نظر میں تو نہیں لیکن عام پڑھنے والوں کی نظر میں) ایک حد تک اس کی دوسری کوتاہیوں کی تلافی کر سکے۔ اس عقیدت کا سبب یہ نہیں کہ وہ میرے بزرگ تھے۔ اس زمانے میں بعض لوگ اپنے نامور بزرگوں کے نام اور کارناموں پر مجاور بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر حالی نے کبھی ادبی مجاوری کو پسند نہیں کیا، کوئی اپنا خاص "سکول" یا حلقہ قائم نہیں کیا۔ ذاتی پراپگنڈے کو ہمیشہ شبہ اور حقارت کی نظر سے دیکھا۔ اس لئے میری عقیدت ان کے ساتھ خاندانی رشتے کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس عظیم الشان خدمت کی وجہ سے ہے جو انہوں نے اُردو ادب، اُردو شاعری اور اُردو زبان کی انجام دی۔ انہوں نے اُردو ادب کو بعض نئی جہتوں اور حیات بخش تحریکوں سے آشنا کیا اور اگر انیسویں صدی میں حالی کا قدم ادب کی سرزمین میں نہ پڑا ہوتا تو شاید آج اس کا مرقع بعض لحاظ سے بہت مختلف ہوتا۔ دوسرا سبب میری عقیدت کا حالی کی لاثانی سیرت ہے۔ حالی انسان کی حیثیت سے ایک ولی صفت شخص تھے اور اس بارے میں مجھے اپنے بزرگوں اور مولانا حالی کے دوستوں اور نیازمندوں وغیرہ سے جو باتیں معلوم ہوئیں ان کی بنا پر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ ان کی ذات میں ان اعلیٰ قدروں کا جلوہ نظر آتا ہے جن پر انسانی فضلیت کا انحصار ہے۔ عقیدت کے یہ دونوں سرچشمے میری نظر میں ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں بلکہ ان کا گہرا تعلق ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ ایک گھٹیا قسم کا انسان اچھا ادیب یا شاعر نہیں ہو سکتا (ادب کی تاریخ اس دعوے کے خلاف ہے) لیکن میرا یہ خیال ضرور ہے کہ ادب اور شاعری میں بہت زیادہ اثر اور خلوص اور زندگی بخشنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اگر ادیب اور شاعر کی زندگی اور کلام و تصنیف میں ہم آہنگی

پائی جائے، اگر حسن آئینہ حق ہو اور دل آئینہ حسن۔ اور حالی کا قلب صافی حسن و صداقت و شرافت کا آئینہ دار تھا۔ اس لئے گو میں نے تنقید کے معاملے میں حتی الامکان غیر جانب داری سے کام لینے کی کوشش کی ہے اور جو ادبی پہلو مجھے کمزور نظر آئے ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ (بعض ماہرین تنقید کی طرح) میں نے تنقید کو فرد قرار داد جرم بنا دیا ہے۔

میں مولانا ابو الکلام آزاد کا کس زبان سے شکر ادا کروں جنہوں نے اپنی شفقت بزرگانہ سے کام لے کر اپنی مصروفیات کے باوجود، اس مسودے کو اول سے آخر تک پڑھا اور نہ صرف کتاب کے لئے مقدمہ عطا فرمایا بلکہ مولانا حالی کے بارے میں چند خاص طور پر دلچسپ اور سبق آموز واقعات لکھ کر اپنے بیان اور قلم کی برکت سے اُسے چار چاند لگا دیئے (ویسے بھی میں جب کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں آپ نے ہمیشہ حالی کی سیرت اور صفات پر روشنی ڈالی اور ان کے بارے میں اپنی بیش بہا رائے اور خیالات سے آگاہ فرمایا ہے) ان کا مقدمہ اور بیش بہا عطیہ دونوں اصل تصنیف سے پہلے زینت کتاب ہیں +

بہرحال کتاب جیسی کچھ ہے ناظرین کی نذر ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو مجھے خوشی ہوگی کہ اس کی بدولت آپ کو حالی کی شخصیت اور کلام سے دلچسپی ہوئی۔ اگر آپ پسند نہ کریں تو دعا کیجیے کہ حالی کا کوئی اور قدر دان ایک بہتر کتاب لکھ کر اس فرض کو ادا کرے۔ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوگی ÷

صالحہ خاتون

13-3-52

۱۹ ستمبر ۱۹۴۹ء

جامعہ نگر۔ دہلی

پیش لفظ

خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کے حالاتِ زندگی پر اس وقت تک کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی گئی ہے جو قابلِ ذکر ہو۔ مجھے یہ دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی کہ خود انہیں کے خاندان کے ایک رکن، عزیزی بیگم صالحہ عابد حسین کو اس کام کی ضرورت کا احساس ہوا، اور انہوں نے وہ تمام حالات جو خاندانی وسائل سے معلوم ہو سکتے تھے، خوش اسلوبی کے ساتھ ایک رسالہ میں جمع کر دیئے۔ بلاشبہ یہ خواجہ صاحب کی مطلوبہ سوانح عمری نہیں ہے، لیکن مطلوبہ سوانح عمری کا ایک ایسا قیمتی مواد ہے جس سے زیادہ مستند مواد ہمیں نہیں مل سکتا تھا، اور جو اگر قیدِ کتابت میں نہ آجاتا، تو ہمیشہ کے لئے ضائع ہو جاتا۔ بیگم صالحہ عابد حسین خواجہ صاحب مرحوم کی نواسی ہیں۔ انہیں بچپن سے موقع ملا تھا کہ گھر کے چھوٹے بڑوں سے اپنے جدِ بزرگوار کی زندگی کا ایک ایک واقعہ سُنیں، اور اسے اپنی خاندانی زندگی کا ایک قیمتی ورثہ سمجھ کر محفوظ رکھیں۔ ظاہر ہے کہ خواجہ صاحب کے حالاتِ زندگی کے لئے اس سے زیادہ مستند ذریعہ علم اور کیا ہو سکتا تھا؟ ہمیں بیگم صالحہ عابد حسین کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے یہ خاندانی امانت قلم و قرطاس کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دی۔

ابوالکلام آزاد

دہلی ۸ ستمبر ۱۹۴۹ء

عطیہ مولانا ابو الکلام آزاد

خواجہ اکرام اللہ مرحوم نے دہلی کے ایک مشاعرے کا حال مجھے سنایا تھا۔ جس میں خواجہ حالؔی مرحوم اور داغؔ مرحوم دونوں شریک ہوئے تھے۔ طرح تھی۔ خبر کہاں، نظر کہاں، داغؔ مرحوم کی غزل مشہور ہے۔

اس مبتدا کی دیکھئے نکلی خبر کہاں

مشاعرہ میں سب غزلیں پڑھ چکے تھے خواجہ صاحب اور داغؔ مرحوم باقی رہ گئے تھے۔ پہلے شمع خواجہ صاحب کے سامنے آئی اور انہوں نے اپنی غزل سُنائی :-

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اَب ٹھیرتی ہے دیکھئے جاکر نظر کہاں

ایک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

حالؔی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح کہے رات بھر کہاں

اکرام اللہ خاں مرحوم کہتے تھے، غزل تمام مشاعرہ پر چھا گئی اور مدح و تحسین کا ایسا ہنگامہ گرم ہوا کہ لوگوں نے خیال کیا، اب داغؔ مرحوم کے لئے کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ خود داغؔ نے کہا اس غزل کے سننے کے بعد میری غزل خود میری نگاہ سے گر گئی۔ جی چاہتا ہے، پرچہ چاک کر دوں۔

ایک عرصے کے بعد جب خواجہ صاحب مرحوم سے نیاز حاصل ہوا تو میں نے غدر کے بعد کے مشاعروں کا تذکرہ چھیڑ دیا اور خصوصیّت کے ساتھ اس مشاعرہ کا حال دریافت کیا۔ خواجہ صاحب حالات بیان کرنے لگے اور تفصیلات کی رد میں دور تک نکل گئے۔ لیکن پھر اچانک انہیں احساس ہوا کہ اب مجھے اپنی غزل

کی مدح و تحسین کے واقعات بیان کرنے پڑیں گے، اس لئے کہتے کہتے یک قلم رک گئے۔ اب میں ہر چند اصرار کر کر کے پوچھتا ہوں، فرمایئے، اس کے بعد کیا ہوا؟ لیکن وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ جی ہاں، بس غزل پڑھی گئی اور مشاعرہ ختم ہو گیا۔ میں نے بار بار پوچھا، آپ کی غزل پر داغ مرحوم نے کیا خیال ظاہر کیا تھا؟ لیکن "جی ہاں، کیا کہا جائے" کے سوا اور کوئی جواب نہیں ملا "جی ہاں" کی "ہاں" کو وہ جس طرح تمدیہ کے ساتھ ادا کرتے تھے، اسے قید کتابت میں لانے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں پاتا کہ "جی ہاں" کی "ہاں" پر ایک لمبی مد کھینچ دوں۔

۱۸۹۲ء میں سر سید مرحوم ایک وفد حیدر آباد لے گئے تھے تاکہ علی گڑھ کالج کے لئے مزید اعانت کی درخواست کریں۔ وفد میں خواجہ صاحب اور مولانا شبلی مرحوم بھی تھے۔ وہاں لوگوں کو خیال ہوا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک مشاعرہ منعقد کرنا چاہیئے۔ چنانچہ مشاعرہ قرار پایا اور تجویز یہ ہوئی کہ کسی خاص طرح کی پابندی نہ رکھی جائے۔ ہر شخص اپنا منتخب اور تازہ کلام سُنائے۔ داغ مرحوم نے اپنی وہ غزل سنائی تھی جو ان کے تیسرے دیوان مہتاب داغ میں ہے ؎

ادھر لا ہاتھ مٹھی کھول، یہ چوری یہیں نکلی

داغ کی زبان، منتخب غزل، اور پھر ان کے پڑھنے کا ہنگامہ خیز انداز، سارا مشاعرہ بے خود ہو گیا اور تعریف کرتے کرتے لوگوں کے گلے پڑ گئے۔ اس کے بعد شمع خواجہ صاحب کے سامنے آئی۔ مولانا شبلی مرحوم کہتے تھے کہ میں پہلو میں بیٹھا تھا میں نے مجلس کا رنگ دیکھا تو خیال کیا کہ یہاں نئی شاعری

کا رنگ جم نہیں سکتا اگر خواجہ صاحب نے اس طرح کی کوئی چیز سنائی تو یقیناً بے مزہ اور پھیکی محسوس ہوگی اور لوگ بے کیف ہو جائیں گے۔ میں نے ان کے کان میں کہا، آپ اپنے قدیم کلام میں سے کوئی چیز سنائیں۔ نئی شاعری کا یہ موقع نہیں۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور کہا جو کچھ ہو مگر "از قاعدہ نہ باید گزشت"

یہ حکیم علوی خاں کا مشہور لطیفہ ہے جو محمد شاہ کا شاہی طبیب تھا یعنی مریض بچے یا نہ بچے، مگر علاج قواعد فن کے مطابق کرنا چاہیئے۔ خواجہ صاحب کا مطلب یہ تھا کہ مشاعرے میں رنگ جمے یا نہ جمے مگر اپنا اصول نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

چنانچہ انہوں نے اپنی نئی قسم کی غزلوں میں سے وہ غزل پڑھی جو دیوان میں موجود ہے۔ کمال تیرا۔ جمال تیرا۔

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جمال تیرا

مولانا شبلی مرحوم کہتے تھے کہ باوجود اس کے کہ ابھی ابھی داغ کی شوخ عاشقانہ غزل تمام مجلس میں تہلکہ مچا چکی تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوا، جیسے جوش مدح و تحسین کی ایک نئی سرگرمی لوگوں میں اُبھر آئی ہو۔ ہر شعر کی تعریف کی گئی۔ داغ مرحوم نے کہا مولانا! یہ آپ ہی کا حصہ ہے اس رنگ میں آپ کا کوئی سہیم نہیں۔

خواجہ صاحب مرحوم کی ایک غزل ہے ؎

اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت

مقطع ہے:۔ ان کو حالی بھی بُلاتے ہیں گھر اپنے مہماں!
دیکھنا آپ کی، اور آپ کے گھر کی صورت

علی گڑھ کالج کا ایک طالب علم داؤد نامی تھا۔ شاعری سے اُسے طبعی مناسبت تھی۔ اس نے اس غزل تضمین کی، اور مقطع کی تضمین کچھ ایسی چسپاں واقع ہوئی، گویا مقطع حالی کا نہیں رہا، داؤد کا ہو گیا۔

جب کسی کام کا کرتا ہے ارادہ انساں　　دیکھ لیتا ہے کہ اس کام کے ہے بھی شایاں
سُن لیے لوگوں سے کہ کل آئے تھے داؤد کے یاں　　ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

چند دنوں کے بعد خواجہ صاحب علی گڑھ آئے۔ چونکہ مقطع کی تضمین میں شوخی طبع نے کام لیا تھا اور ایک طرح کا گستاخانہ پہلو تھا، اس لئے داؤد نے اپنے دوستوں کو تاکید کر دی تھی کہ اس تضمین کا ذکر خواجہ صاحب سے نہ کریں، لیکن کسی شخص نے کر دیا۔ خواجہ صاحب کو جو ہیں یہ بات معلوم ہوئی۔ نہایت درجہ خوش ہوئے۔ اصرار کر کے داؤد کو بلوایا اور مجبور کیا کہ پوری تضمین سُنائے۔ پھر تعریف کر کے اس کا دل بڑھایا، اور دیوان حالی درجۂ اوّل کا چھپا ہوا بطور صلہ کے عطا فرمایا۔ اور کہا یہی ایک نسخہ ہے جو میں نے اپنے لئے رکھا تھا لیکن اب میں اس کا مستحق اپنے سے زیادہ تمہیں سمجھتا ہوں۔

افسوس ہے، اس طالب علم کا جوانی میں انتقال ہو گیا۔

ایک سنجیدہ آدمی کوئی معمولی سی بات بھی ظرافت کی کہہ دیتا ہے تو وہ غیر معمولی تاثر اور کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم سر تا پا سنجیدگی تھے۔ لیکن اس سنجیدگی کے ساتھ طبیعت میں ظرافت بھی تھی۔ اور نہایت لطیف پیرایہ میں ظاہر ہوتی تھی۔ اس سلسلہ میں مولانا شبلی مرحوم نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا تھا۔

مولانا شبلی مرحوم اگرچہ علی گڑھ کے قیام کے بعد سرسید مرحوم کے خیالات سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور در اصل تصنیف و تالیف اور فکر و نظر کا نیا مذاق اسی تاثر سے ان میں پیدا ہوا، تاہم وہ مذہبی خیالات میں اپنے آپ کو سرسید مرحوم کے مقلدوں سے الگ رکھتے تھے، اور جب کبھی کوئی موقعہ نکل آتا بلا تامل اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں سرسیّد کو پیر نیچر کہا جاتا تھا اور ان کے مقلدوں کو نیچری۔ بنیاد اس تلقب کی یہ تھی کہ انہوں نے اپنی تحریرات میں جابجا نیچر اور لاز اف نیچر یعنی فطرت اور قوانین فطرت کا ذکر کیا تھا، اور اس پر زور دیا تھا کہ دینی تعلیم کو قوانین فطرت کے خلاف نہیں ہونا چاہیئے۔

جس زمانے میں سرسیّد مرحوم سورہ اسریٰ کی تفسیر لکھ رہے تھے تو اکثر واقعۂ اسریٰ یعنی معراج کا تذکرہ رہتا تھا۔ معراج کے متعلق حضرت عائشہ کا مذہب معلوم ہے کہ وہ معراجِ جسمانی کی قائل نہ تھیں۔ سرسیّد نے بھی یہی مسلک اختیار کیا، اور معراجِ جسمانی کی روایات جمع کر کے ان کی ہر طرح تضعیف کی۔ ایک دن سرسیّد کے یہاں خواجہ صاحب مرحوم بھی تھے اور مولانا شبلی بھی۔ حضرتِ عائشہ کے مذہب کا تذکرہ ہونے لگا۔ مولانا شبلی ازراہِ ظرافت بول اُٹھے کہ معلوم ہوتا ہے، حضرتِ عائشہ بھی نیچری تھیں۔ ورنہ معراجِ جسمانی سے کیوں انکار کرتیں؟ یہ سنتے ہی خواجہ صاحب نے کہا" اس سے ثابت ہوا کہ نیچری ہونا بڑی ہی فضیلت کی بات ہے کہ حضرتِ عائشہ تک اس جرگے میں داخل ہیں۔ لیکن مولانا! کل تو آپ بڑے اصرار سے کہہ رہے تھے کہ میں نیچری نہیں ہوں۔ اچھا، اب معلوم ہوا یہ آپ کا انکسار تھا!

سفرنامہ حکیم ناصر خسرو

خواجہ صاحب کی علمی خدمات کے سلسلہ میں ایک کتاب کا ذکر رہ گیا ہے یعنی حکیم ناصر خسرو کے سفرنامہ کی تصحیح اور اشاعت۔

حیات سعدی کا پہلا ایڈیشن جو دہلی میں چھپا تھا، میرے کتب خانے میں ہوگا مجھے یاد ہے کہ اس کے ٹائیٹل پیج پر اس سفرنامے کا اشتہار چھپا تھا اس سے معلوم ہوا کہ حیات سعدی سے پہلے یہ کتاب چھپ چکی تھی۔

ابوالکلام

نذرِ عقیدت

برادرِ محترم ذاکر صاحب کی خدمت میں جنہوں نے تعلیم میں اُن اعلیٰ قدروں کی رُوح پھونکی جن سے حالیؔ نے ادب کو روشناس کیا تھا۔

نشوونما

پانی پت کے محلّہ انصار میں ایک بزرگ خواجہ ایزد بخش انصاری رہتے تھے. ان کے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تو پہلے ہی سے تھیں ۱۸۳۷ء/۱۲۵۳ھ میں ایک اور لڑکا پیدا ہوا جس کا نام الطاف حسین رکھا گیا۔ اسی لڑکے کو آج دنیا حالی کے نام سے جانتی ہے. نو برس کی چھوٹی سی عمر میں الطاف حسین کو یتیمی کا داغ سہنا پڑا۔ قدرت جس شخص سے دنیا میں کوئی بہت بڑا کام لینا چاہتی ہے اُسے اکثر بچپن ہی میں ماں یا باپ کی آغوشِ شفقت سے جدا کر دیتی ہے۔ شاید اس لئے کہ جو بچے بچپن سے مصیبت اور صدمے اُٹھائے ہوتے ہیں اُن کے دل دوسروں سے زیادہ نرم اور گداز حساس اور دردمند اور اسی کے ساتھ مضبوط بھی ہوتے ہیں. باپ کے انتقال سے پہلے ہی الطاف حسین ماں کی تربیت سے محروم ہو چکے تھے. ان کی والدہ کے دماغ میں کچھ خلل سا آگیا تھا اور اس لئے وہ عرصے سے دنیا کے معاملات سے بیگانہ اور عام طور پر بالکل خاموش رہا کرتی تھیں، ماں کے دماغ کی خرابی اور باپ کی بے وقت موت سے الطاف حسین کے ننھے سے دل پر جو چوٹ لگی اس کی بہت کچھ تلافی بھائی بہنوں کی محبّت نے کر دی۔ بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے چھوٹے بھائی کو اپنے سایۂ شفقت میں لے لیا اور بہنوں نے بھی اِس دُرِّ یتیم کی پرورش میں اپنی جان لڑا دی۔

پرانے زمانے کے دستور کے موافق چار ساڑھے چار سال کی عمر میں الطاف حسین کی بسم اللہ ہوئی۔ پانی پت کا ایک پرانا دستور یہ تھا کہ وہاں ہر مسلمان بچہ قرآن شریف کا ایک حصہ ضرور حفظ کرتا تھا اور وہاں کی قرأت سارے ملک میں مشہور تھی۔ الطاف حسین کو پانی پت کے ایک جیّد قاری حافظ ممتاز حسین کے پاس قرآن شریف کی تعلیم کے لئے بٹھایا گیا۔ ان کو پڑھنے کا بچپن سے بے حد شوق تھا اور حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا چنانچہ انہوں نے جلدی ہی قرآن شریف حفظ کر لیا۔ وہ بچپن سے قرآنِ پاک اس قدر خوش الحانی اور صحت کے ساتھ پڑھتے تھے کہ بڑے بڑے قاری اور عالم تعریف کرتے تھے۔ اُن کا اپنا بیان یہ ہے کہ اس کے بعد سے پھر کبھی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن طبیعت کو علم سے فطری طور پر لگاؤ تھا اس لئے یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ حفظ قرآن کے بعد فارسی کی تھوڑی سی تعلیم سید جعفر علی سے حاصل کی جو فارسی کے بہت اچھے ادیب اور سخن فہم سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے فیضِ صحبت سے الطاف حسین کو اُسی وقت سے نہ صرف فارسی زبان اور ادب سے دلچسپی پیدا ہوگئی بلکہ ان کی طبیعت میں شاعری کا جو فطری مادہ تھا اُسے بھی جلا ملی۔

فارسی کے ساتھ ساتھ اُنہیں عربی کا بھی شوق پیدا ہوا۔ پانی پت کے ایک نوجوان حاجی ابراہیم حسین صاحب اُسی زمانے میں تحصیل علم کے بعد مجتہد بن کر واپس آئے تھے۔ الطاف حسین نے ان سے عربی سیکھنی شروع کی اور صرف و نحو کی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنی تعلیم کو تکمیل کے درجے تک پہنچائیں۔ لیکن ابھی عمر کی صرف سترہ ہی منزلیں طے کی تھیں کہ خاندان کے بزرگوں کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ ان کی شادی کریں۔ الطاف حسین کو اس وقت شادی کی ذرا بھی خواہش نہ تھی۔ ابھی انہوں نے علم کے دریا سے ایک

چُلّو ہی پیا تھا اور جی بھر کر سیراب ہونا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر شادی ہوگئی تو تعلیم کو ترک کر کے روزی کمانے کی فکر کرنی ہوگی۔ لیکن بزرگوں کو اس کی کیا پروا کہ خود الطاف حسین کیا چاہتا ہے؟ ان کے بڑے بھائی نے اپنے ماموں میر باقر علی کی بیٹی اسلام النساء سے ان کا بیاہ ٹھہرا دیا۔ الطاف حسین کے لئے بھائی کا حکم گویا باپ کا حکم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نوجوان اکثر اپنی بڑی سے بڑی خواہش اور آرزو کو بزرگوں کے حکم پر قربان کر دیتے تھے۔ اور ماتھے پر بل تک نہ لاتے تھے۔ الطاف حسین بچپن سے دیکھتے آئے تھے کہ بزرگوں کی کسی رائے سے اختلاف کرنا یا ان کے حکم سے انکار کرنا خاندانی روایات اور آدابِ شرافت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے بھائی کو بہت چاہتے تھے اور ان کی خواہش کو رد کر کے ان کے دل کو دُکھ نہیں پہنچا سکتے تھے۔ لہٰذا وہ سعادت مندی کے تقاضے سے مجبور ہوگئے اور سترہ سال کی عمر میں ان کی شادی رچا دی گئی۔

شادی تو ہوگئی مگر علم کی پیاس کم نہیں ہوئی۔ بیوی خوش حال گھرانے کی تھیں۔ الطاف حسین نے اس کو غنیمت جانا کہ ابھی بیوی کا بار ان کے اوپر نہیں۔ اس فرصت سے پورا فائدہ اُٹھانے کے لئے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ دِلّی جا کر جو اس اُجڑی حالت میں بھی علوم فنون کا مرکز تھی تحصیلِ علم کریں۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ دِلّی جانا گویا کسی دوسرے ملک کا سفر کرنا تھا۔ ریل اس وقت تک جاری نہیں ہوئی تھی۔ اونٹ گاڑی یا بیل گاڑی پر یا پیدل سفر کرنا ہوتا تھا اور پردیس جا کر جلدی واپس آنا مشکل ہو جاتا تھا۔ الطاف حسین جانتے تھے کہ انہیں دِلّی جانے کی اجازت نہ ملے گی۔ ایک دن جب ان کی بیوی اپنے میکے گئی ہوئی تھیں وہ بغیر کسی سے کچھ کہے سُنے اور بغیر کسی سامان کے پاپیادہ دِلّی کی طرف روانہ ہوگئے۔ شاید راستے میں اونٹ گاڑی یا بیل گاڑی میں بھی کچھ

مسافت طے کی ہو۔

علم کا یہ سچّا شیدائی جب دِلّی پہنچا تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ خدا ہی جانے یہ کٹھن زمانہ کس طرح کاٹا؟ کیسے گزر بسر کے قابل پیسہ کمایا۔ اُس زمانے کا مفصّل حال کہیں دستیاب نہیں ہوتا اتنا البتہ معلوم ہے کہ جامع مسجد کے قریب حسین بخش کا مدرسہ تھا جس میں مشہور فاضل اور واعظ مولوی نوازش علی درس دیتے تھے۔ الطاف حسین اس میں داخل ہو گئے۔ اور بہت عسرت کے ساتھ اور تکلیف اٹھا کر علم کی دولت حاصل کرنی شروع کی۔ اُنہیں طلبِ علم کی دھن میں آرام و آسائش کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ تکیہ نہ ہوتا تو سر کے نیچے اینٹیں رکھ لیتے' کھانے کو نہ ملتا تو رات کو بھوکے سُو رہتے۔ روح کی بھوک' دل کی پیاس بجھانے میں ان چیزوں کی طرف دھیان ہی نہ جاتا تھا۔

مولوی نوازش علی کے علاوہ دِلّی کے زمانہ قیام میں انہوں نے مولوی فیض حسن مولوی امیر احمد اور شمس العلما میاں سیّد نذیر حسین کے درس سے بھی استفادہ کیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا چرچا تھوڑا بہت شروع ہو چکا تھا اور قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا۔ مولوی نذیر احمد' مولوی محمد حسین آزاد' مولوی ذکاء اللہ وغیرہ اس میں تعلیم پاتے تھے مگر الطاف حسین اس دنیا سے بالکل بے خبر تھے۔ ان کے وطن پانی پت میں انگریزی تعلیم کو گناہ اور بدعت سمجھا جاتا اور انگریزی مدرسوں کو "مجہلے" (جہالت کی جگہ) کہا جاتا تھا۔ دِلّی آئے تو جس مدرسے میں پڑھنا شروع کیا وہاں بھی انگریزی پڑھنے کو عیب اور انگریزی دانوں کو جاہل سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے اگرچہ الطاف حسین ڈیڑھ برس دِلّی میں رہے اور ان کے دل میں علم کی سچّی لگن موجود تھی لیکن کبھی بھول کر انگریزی مدرسے میں پڑھنے یا اُسے جا کر دیکھنے تک کا شوق نہ پیدا ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں انہوں نے محض انگریزی کتابوں کے ترجمے پڑھ کر وہ کچھ حاصل کر لیا جو لوگ انگریزی تعلیم میں

ساری زندگی کھپانے کے بعد بھی نہیں پاسکتے۔

دلّی کے زمانہ قیام میں جب ان کی عمر غالباً اٹھارہ سال کی تھی انہوں نے عربی میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھی۔ یہ ان کی سب سے پہلی تصنیف تھی۔ مصنف کو اپنی تصنیف اور پہلی تصنیف سے جو محبّت ہوتی ہے اُسے کون اہلِ قلم نہیں جانتا۔ پہلی تصنیف اس کی ادبی زندگی کا سنگ بنیاد ہوا کرتی ہے۔ اور اس موقع پر اس کو قدردانوں کی حوصلہ افزائی کی بہت سخت ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ان کی پہلی تصنیف کا جو نہایت محنت اور خوبی سے لکھی گئی تھی جو حشر ہوا وہ بھی قابل ذکر ہے۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اس کا ذکر یوں لکھا ہے۔

"غدر سے دو تین سال پہلے مولانا دہلی میں زیر تعلیم تھے۔ اُس زمانے میں ایک عربی رسالہ آپ نے تصنیف کیا جس میں ایک منطقی مسئلہ مولوی صدیق حسن خان بہادر کی تائید میں تھا۔ جسے ان کے استاد نے پڑھ کر نہایت ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ اُسے چاک کر دیا۔ مولانا کو قدرتی طور پر رنج ہوا لیکن استاد نے جو مشہور حنفی عالم تھے اور حسین بخش کے مدرسے میں پڑھاتے تھے کہا کہ رسالہ اگرچہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا تھا مگر چونکہ ایک وہابی مولوی کی تائید میں تھا۔ اس لئے چاک کر دیا گیا"۔

اُسی زمانے میں علم وفن کی شمع دِلّی میں بجھنے سے پہلے بھڑک اُٹھی تھی۔ علاوہ اور علوم وفنون کے شاعری بھی فروغ پر تھی۔ الطاف حسین کو بھی اکثر مشاعروں میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ اور فطرت نے جو خداداد جوہر ان کو ودیعت کیا تھا وہ اُبھرنے لگا۔ خوش قسمتی سے ان کی ملاقات مرزا غالبؔ سے بھی ہوگئی۔ اُس زمانے میں غالبؔ کا کلام عام طور پر مقبول نہ تھا۔ لیکن خاص خاص لوگ اُس کی بے حد قدر کرتے تھے۔ الطاف حسین کو مرزا کا کلام دل سے پسند

آیا۔ وہ اکثر ان کے پاس جاتے اور ان کے اردو فارسی کے مشکل شعروں کا مطلب خود ان سے سمجھا کرتے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ایک آدھ غزل اردو اور فارسی کی لکھ کر مرزا غالبؔ کو دکھائی۔ غالبؔ بڑے سخت نقاد تھے اور اس بات سے بہت خفا ہوا کرتے تھے کہ ہر کس و ناکس شعر کہنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اس سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے کے ابتدائی کلام کو دیکھ کر وہ پھڑک گئے۔ انہوں نے وہ جوہر قابل پرکھ لیا جو آگے چل کر ایک دنیا کو مسحور کرنے والا تھا۔ اور کہا "میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے"۔ الطاف حسین کو اپنے تعلیمی مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی تھی لیکن غالبؔ کی ہمت افزائی کی بنا پر انہوں نے شعر گوئی کی تھوڑی بہت مشق جاری رکھی۔ وہ اس زمانے میں خستہ تخلص کرتے تھے۔

الطاف حسین دل لگا کر تعلیم پا رہے تھے اور ساتھ ہی شعر و سخن کی محفلوں سے لطف اٹھا رہے تھے کہ ان کے دِلّی میں موجود ہونے کی خبر پانی پت پہنچ گئی۔ خاندان والے سن کر بے قرار ہو گئے اور بڑے بھائی اور کئی دوسرے عزیز دِلّی آئے اور انہیں مجبور کیا کہ گھر واپس چلو۔ اگرچہ ان پر تعلیم چھوڑنا سخت شاق تھا۔ مگر بھائی کی بات کو ٹال نہیں سکتے تھے۔ بادلِ ناخواستہ ۱۸۵۵ء میں پھر پانی پت واپس آ گئے۔ مگر یہاں پہنچ کر پھر تحصیلِ علم میں اس طرح محو ہو گئے کہ کسی چیز کی خبر نہ رہی۔

الطاف حسین کو گھر آئے ڈیڑھ برس گزر گیا۔ وہ اپنے مطالعے میں مصروف تھے۔ لیکن عزیزوں اور دوستوں کا مسلسل اصرار تھا کہ فکر معاش کرو۔ اس عرصے میں غالباً ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ جب لوگوں کا اصرار بہت بڑھ گیا تو مجبوراً اپنی

تعلیم کو چھوڑ کر ۱۸۵۶ء میں تلاش معاش میں گھر سے نکلے اور آخر کار حصار میں انہیں تھوڑی سی تنخواہ پر ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں جگہ مل گئی۔

الطاف حسین نوکر تو ہو گئے مگر انہیں اطمینان سے کام کرنا یہاں بھی نصیب نہ ہوا۔ یہ زمانہ ہی انتشار اور پریشانی کا تھا۔ ملک میں ایک طرف انگریزی حکومت کا تسلط رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا، دوسری طرف لوگوں میں اس حکومت کے خلاف بغاوت کے جذبات اندر ہی اندر نشو و نما پا رہے تھے جو ایک دم آتش فشاں مادّے کی طرح پھٹ پڑے اور ۵۷ء میں وہ ہنگامہ شروع ہو گیا جسے غدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سارے ملک خصوصاً شمالی ہند میں ایک قیامت برپا تھی۔ کسی کو اپنا جان و مال محفوظ نظر نہ آتا تھا۔ حصار میں بھی جہاں الطاف حسین نوکر تھے سخت گڑبڑ مچی ہوئی تھی۔ ایسے وقت ہر شخص کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے وطن میں اپنے عزیزوں کے ساتھ ہو۔ الطاف حسین نے اللہ کا نام لیا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر حصار سے پانی پت روانہ ہو گئے۔ راستے میں ان پر جو کچھ گزری اس کا اندازہ آپ کو ان کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کے بیان سے ہو گا۔

"والد جس گھوڑی پر سفر کر رہے تھے وہ بھی ڈاکوؤں نے چھین لی اور آپ کے پاس صرف ایک حمائل (چھوٹا قرآن شریف) باقی رہ گئی تھی۔ جب پانی پت پہنچے تو پیدل سفر کی صعوبت اور رستہ میں ناموافق اور ناوقت غذاؤں کی وجہ سے آپ کو اسہال کی شکایت ہو گئی جو ایک سال سے زیادہ رہی اور آخر پانی پت کے مشہور طبیب حکیم خورشید صاحب مرحوم نے والد کو گدّیوں (بکرے کی گھٹنے کی ہڈی) کا پلاؤ بتایا اور اس سے مرض کا ازالہ ہو گیا۔ جوانی میں والد مرحوم کے قوےٰ بہت اچھے تھے اور آپ کو کسرت کا بھی شوق تھا لیکن معلوم ہوتا ہے۔

کہ اس حصار سے پانی پت تک کے سفر میں جو تکلیف اٹھائی اس نے ان کی صحت پر بہت بُرا اثر ڈالا اور آپ کثر معدے اور سینے اور پھیپھڑے کے امراض میں مبتلا رہنے لگے باوجود انتہائی احتیاط کے جو آپ کی عادت تھی۔"

بہر حال وہ کسی نہ کسی طرح پانی پت پہنچ ہی گئے۔ عزیز و اقارب نے زندہ سلامت دیکھا تو جان میں جان آئی۔ پانی پت اگرچہ فتنہ و فساد سے بچا رہا لیکن اُس وقت تک لوگوں کو سخت خطرہ تھا۔ دِلّی جہاں یہ قیامت بپا تھی چھپیں کوس ہی تو تھی، وہاں کے تباہ حال خاندانوں میں سے بہت سے لوگوں نے پانی پت کو منتخب کیا اور دِلّی سے بھاگ کر یہاں آگئے۔ پانی پت والوں نے اُس وقت سچی انسانی ہمدردی کا ثبوت دیا اور اپنے گھروں اور دِلوں کے دروازے ان مصیبت کے ماروں کے لئے کھول دیئے۔ الطاف حسین اس وقت بیس سال کے نوجوان تھے۔ مگر تجربہ متانت اور زمانہ شناسی بوڑھوں جیسی تھی۔ دل ایسا درد مند اور حساس پایا تھا کہ چیونٹی کی تکلیف پر بھی دُکھ جاتا تھا۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد نہ کرتے۔ دوسروں کے ساتھ وہ بھی اس کام میں لگ گئے۔ الطاف حسین کے گھر میں جن لوگوں نے پناہ لی تھی ان میں سے بعض یہیں کے ہو رہے۔ ایک مصیبت زدہ خاندان کی کفالت ان کے بھائی بھاوج نے ہمیشہ کے لئے اپنے ذمہ لے لی تھی۔ ایک اور اسی سالہ بوڑھی بی مٹریا کو ہم نے خود دیکھا تھا۔ یہ بی بی غدر میں دس سال کی تھیں۔ عقد ہو چکا تھا، رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ غدر کا ہنگامہ برپا ہوا اور ماں باپ، عزیز و اقارب شوہر سب مارے گئے اور اس کم سن لڑکی نے الطاف حسین کے خاندان میں آکر پناہ لی اور پھر اپنی ساری عمر انتہائی شرافت اور عزت و خودداری کے ساتھ اس گھر میں گزار دی جب تک ہاتھ پاؤں چلتے رہے سلائی کر کے، چھالیہ کاٹ کے، طرح طرح کے کشیدے

کے کام اجرت پر کرتی اور اپنا خرچ چلاتی رہیں۔ آخر عمر میں مولانا حالی کی بڑی پوتی مشتاق فاطمہ نے ان کی دیکھ بھال اور خدمت کا بار اپنے ذمہ لے لیا تھا اور ان کی وفات تک ان کی ایسی خدمت کرتی رہیں جیسے کوئی بڑی سعادت مند بیٹی اپنی ماں کی کرتی ہے۔

خواجہ الطاف حسین بھی جب تک زندہ رہے بی مٹھریا کا بڑا لحاظ اور خیال کرتے تھے۔ عمر بھر بی مٹھریا کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ اسی خاندان کی ایک معزز فرد نہیں ہیں۔

غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد بھی برسوں تک ملک کی حالت ایسی رہی کہ ہر شخص گھر سے نکلتے اور باہر جاتے گھبراتا تھا۔ کاروبار، دفتر، اسکول، کالج سب بند تھے۔ جو تھا وہ اپنی جگہ سہما ڈرا ہوا۔ سرکارِ انگریزی نے انتقام کے جوش میں دلّی کے بیشتر معزز گھرانوں کو نیست و نابود کر دیا۔ جس کسی پر کسی دشمن نے جھوٹ موٹ کوئی الزام لگا دیا اُسے بے تکلف سولی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ دلّی کا کوئی محلہ نہ تھا جہاں سولی نہ کھڑی کی گئی ہو!

اس زمانے میں الطاف حسین کو مسلسل چار سال پانی پت میں رہنا پڑا۔ نوکری چھوٹ چکی تھی، کسی اور نوکری کا فی الحال کوئی امکان نہ تھا اس لئے غالباً خیر خواہوں نے بھی یہ اصرار کرنا چھوڑ دیا ہوگا کہ ملازمت کرو۔ الطاف حسین نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور پوری توجہ اپنی تعلیم کی تکمیل کی طرف کر دی۔ وہ خود اپنی اس زمانے کی تعلیم کا حال یوں لکھتے ہیں: "اس زمانے میں پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم ان سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے، کبھی منطق کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ

کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شرح و لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا۔" غالباً اسی زمانے میں الطاف حسین نے اپنا مشہور تخلص حالی اختیار کیا۔

حالی کے بڑے بیٹے خواجہ اخلاق حسین مرحوم کی پیدائش غالباً اُس وقت ہو چکی تھی جس زمانے میں وہ دِلّی سے واپس آ کر پانی پت رہے تھے۔ حالی کے بھائی خواجہ امداد حسین نے جو لاولد تھے انھیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ حالی جب ان کا ذکر کرتے تو "برادر زادہ" کہہ کر کرتے ہیں۔ اس عرصے میں ان کے کئی اور بچے پیدا ہوئے اور بعض مر بھی گئے۔ ان کی بیٹی عنایت فاطمہ جو زندہ رہیں وہ بھی غالباً اس زمانے میں پیدا ہوئی تھیں۔ سب سے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کی ولادت ۱۲۷۹ھ میں ہوئی۔

اب حالی کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ خاندانی جائداد بہت تھوڑی تھی۔ سارے خاندان کا بار بڑے بھائی کی تنخواہ پر تھا۔ آخر حالی کو پھر روزی کی فکر میں تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا اور وہ تلاشِ معاش میں دِلّی روانہ ہوئے۔ دِلّی کو غدر نے تباہ و برباد کر دیا تھا مگر اس لٹنے کے بعد بھی اس کی پرانی شان کچھ نہ کچھ باقی تھی۔ اب بھی علم و فن اور شعر و سخن کا اچھا خاصا چرچا تھا۔ حالی دِلّی آئے تو شعر و سخن کا ذوق پھر تازہ ہو گیا اور وہ علمی مجلسوں اور ادبی محفلوں میں آنے جانے لگے۔

دِلّی میں ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ہو گئی۔ شیفتہ اس ذہین، شریف، نیک سیرت نوجوان سے جس نے اس کم سِنی ہی میں علم و فضل میں غیر معمولی قابلیت پیدا کر لی تھی اور جس کا ذوقِ سخن نہایت پاکیزہ تھا بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے حالی کو جہانگیر آباد بلا کر اپنے بچوں کی اتالیقی ان کے سپرد کر دی۔ اور اس طرح آٹھ سال کے قریب حالی اور شیفتہ ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ شیفتہ سے حالی کو گہرا تعلق تھا اور وہ ان کی سخن فہمی اور ذوقِ شعر کے بڑے قائل تھے۔

ان کا اپنا بیان ہے کہ انہیں غالب کی اصلاح سے وہ فائدہ نہیں ہوا جو شیفتہ کی صحبت سے۔" نواب مصطفےٰ خاں مرحوم رئیس دلّی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے، جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے۔ اور شاعری کا اعلیٰ درجے کا ذوق رکھتے تھے شناسائی ہو گئی اور سات آٹھ برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔

نواب صاحب جس درجے کے شاعر تھے اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں اپنا فارسی کلام مومن خاں کو دکھایا تھا، مگر ان کے مرنے کے بعد مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا میلان طبعی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اُٹھا۔ اُس زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر در حقیقت مرزا کے مشورے اور اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا، اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔۔۔۔ ان خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔"

حالی کا مستقل قیام تو جہانگیر آباد میں رہتا تھا مگر دلّی بھی شیفتہ کے ساتھ اکثر آتے اور رہتے تھے۔ مرزا غالب سے جو دونوں کے دوست اور استاد تھے

خوب صحبتیں گرم رہا کرتی تھیں۔ حالی کی جوانی کی عمر تھی۔ طبیعت پر مذہبی رنگ غالب تھا اور جیسا کہ اس عہد کا دستور ہے عقائد میں سختی بھی تھی۔ مولوی استادوں کے خیالات کا رنگ ابھی تک چڑھا ہوا تھا۔ غالب سے دلی محبت تھی اور لازماً ان کی آخرت کی فکر بھی ستاتی تھی۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ غالب بڑھاپے کے باوجود اب تک شراب پئے جاتے ہیں اور کبھی بھول کر بھی نماز نہیں پڑھتے تو انہیں قدرتی طور پر اس کا بہت رنج ہوا۔ وہ خود لکھتے ہیں" ..... جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہوجاتا ہے اسی قدر اس بات کی زیادہ تمنا ہوتی تھی کہ اس کا خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم میں نجات و مغفرت کے لئے ناگزیر ہے۔ چونکہ مرزا کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجہ غائت تھا اس لئے ہمیشہ ان کی حالت پر افسوس ہوتا تھا گویا یہ سمجھتے تھے کہ روضہ رضواں میں ہمارا اُن کا ساتھ چھوٹ جائے گا اور مرنے کے بعد پھر ان سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔"

چنانچہ حالی نے غالب کو ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس میں انہیں نماز پڑھنے کی تاکید کی، فرض کا احساس دلایا اور درخواست کی کہ " آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے نماز پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی مگر نماز ترک نہ ہو۔" اس زمانے میں غالب کے پاس بہت سے خط آیا کرتے تھے جن میں ان کو بے دین اور ملحد اور کافر اور خدا جانے کیا کیا لکھا ہوتا تھا بعض خطوں میں تو گالیاں تک ہوتی تھیں۔ غالب ان کو بکواس سمجھتے اور پروا نہ کرتے لیکن حالی کے خط سے انہیں بہت صدمہ ہوا۔ وہ پھٹ پڑے اور بہت رنج اور غصے کا اظہار کیا۔ اگلے دن ایک غزل بھیجی جس میں اس نصیحت کا شکوہ تھا۔ حالی نے معذورت کے طور پر ایک قطعہ لکھا۔ اس کے جواب میں غالب نے یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری
ہمی بلطف تو خود را امید وار کنم

چو حالی از منِ آشفتہ بے سبب رنجید
تو گر شفیع نہ گردی بگو، چہ کار کنم

دو بارہ عمر دہندم اگر بفرضِ محال
براں سرم کہ دراں عمر ایں دو کار کنم

یکے ادائے عبادات عمرِ پیشینہ
دگر بہ پیشگہِ حالی اعتذار کنم

حالی نے سخت ندامت کے ساتھ ایک قطعہ لکھا۔ آخر غالب نے کہا "بابا بیت بخشی موقوف" غالب کی شکایت حالی سے محبت ہی پر مبنی تھی۔ وہ حالی کو بہت چاہتے اور بڑی عزت کرتے تھے۔

اپنی غلطی کا احساس اور اس کا صاف صاف اعتراف صرف عالی ظرف لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ حالی کو نوجوانی کی اس معمولی سی غلطی کا اور اس کا کہ جوش میں وہ غالب سے بے ادبی کر بیٹھے عمر بھر افسوس رہا۔ یادگار غالب میں انہوں نے اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں کس فراخ دلی سے اپنے اُس زمانے کے عقائد پر اعتراض کرتے ہیں۔ "یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی کے نشے میں سرشار تھے۔ خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے تہتّر فرقوں میں سے صرف اہلِ سنّت کو اور اہلِ سنّت میں سے صرف حنفیّہ کو اور ان میں سے بھی صرف ان لوگوں کو مغفرت کے لائق جانتے تھے۔ گویا دائرہ رحمت الٰہی کو کوئن وکٹوریہ کی وسعتِ سلطنت سے بھی، جس میں ہر مذہب و ملّت کے آدمی بہ امن و امان زندگی بسر کرتے ہیں، زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتے تھے"۔

۱۸۶۹ء میں شیفتہ کا انتقال ہو گیا اور حالی کو پھر معاش کی فکر ہوئی۔ اس مرتبہ لاہور میں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں انہیں ایک جگہ مل گئی۔ یہاں ان کے ذمے یہ کام تھا کہ جن کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو ان کے ترجمے پر نظر ثانی کر کے عبارت درست کریں۔ حالی کی زندگی کا رُخ بدلنے میں اس ملازمت کو بڑا دخل

ہے۔ وہ چار برس تک لاہور میں یہ کام انجام دیتے رہے اور اس بہانے قدرت نے انگریزی نہ پڑھ سکنے کی کمی پوری کردی۔ حالیؔ انگریزی زبان اور ادب کی بہت سی کتابوں کے مطالب سے واقف ہوگئے۔ اس مطالعے سے حالیؔ کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہیں ادب کے صحیح مقام کا اندازہ ہوا۔ اور انہوں نے جانا کہ ادب کے ذریعے کس طرح انسانوں کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ یہ اثر رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ روز بروز حالیؔ کی نظروں میں مشرقی لٹریچر خاص کر فارسی لٹریچر کی، جس سے اب تک انہیں بہت لگاؤ تھا، وقعت کم ہونے لگی اور مغربی ادب کی طرف رحجان بڑھتا گیا۔ ان پر نہ صرف مغربی ادب کا گہرا اثر پڑا۔ بلکہ انگریزی زبان سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ وہ اپنی نثر میں انگریزی الفاظ بے تکلف استعمال کرتے ہیں اور کہیں کہیں تو شعر تک میں لے آتے ہیں۔

حالیؔ لاہور ہی میں تھے کہ مولوی محمد حسین آزاد نے جو عرصے سے اردو شاعری کی اصلاح کی فکر میں تھے۔ اپنا ایک پرانا ارادہ پورا کیا۔ اور ۱۸۷۴ء میں ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں بجائے مصرع طرح کے شاعروں کو کسی مضمون کا عنوان طبع آزمائی کے لئے دیا جاتا تھا کہ وہ جس اسلوب سے اور جس بحر میں چاہیں اپنے خیالات نظم کریں۔

حالیؔ تو اس موقع کے انتظار ہی میں تھے کہ بے مصرف غزل گوئی کو چھوڑ شاعری کی کوئی نئی راہ انتخاب کریں۔۔۔۔ چنانچہ بڑی خوشی اور گرم جوشی کے ساتھ انہوں نے اس نئے وضع کے مشاعرے کا خیر مقدم کیا اور اس کے چار جلسوں کے لئے چار مسلسل نظمیں یا مثنویاں لکھیں۔ برکھا رُت، اُمید، تعصب و انصاف اور حب وطن۔ یہ چاروں نظمیں بڑی دلکش، شیریں اور دلچسپ ہیں۔ خصوصاً حُب وطن اپنا جواب آپ ہی ہے۔ حالیؔ سے پہلے اور غالباً بعد میں بھی اس موضوع پر اتنی پُر خلوص

پرکیف اور پُر اثر نظم کسی نے نہیں کہی ۔

لاہور کے قیام کے زمانے میں حالی نے نثر میں بھی کئی کتابیں لکھیں ۔ ایک کتاب تریاق مسموم لکھی جو اپنے ایک ہم وطن مسلمان کی کتاب کے جواب میں تھی جو اس نے عیسائی ہو جانے کے بعد لکھی تھی ۔ ایک جیالوجی کی کتاب کا عربی سے ترجمہ کیا اور اس کا حق تصنیف بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونیورسٹی کو دیدیا ۔ تیسری کتاب مجالس النساء تصنیف کی جس میں قصے کے پیرائے میں عورتوں کی تعلیم و تربیت اور بچوں کی پرورش کے بہترین اصول اور طریقے دلچسپ انداز میں بیان کئے ہیں ۔ یہ کتاب اُس زمانے میں بہت مقبول ہوئی اور عرصۂ دراز تک پنجاب کے زنانہ اسکولوں کے کورس میں شامل رہی اور کرنل ہالرائڈ نے جو علمی ادبی تصانیف کے بڑے قدردان تھے اس پر چار سو روپے کا انعام بھی دلایا ۔

حالی تقریباً چار سال لاہور میں رہے مگر ان کا دل وہاں ایک دن بھی نہیں لگا ۔ ان کو دلّی سے محبت تھی اور ہونی ہی چاہیئے تھی ۔ پانی پت اُن کا وطن تھا اور دلّی ان کا وطنِ ثانی ۔ مگر وطنِ ثانی کی محبت اصلی وطن سے بھی بڑھ گئی تھی ۔ اُن کا دل دلّی اور دلّی کی صحبتوں کے لئے ترستا تھا ۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

رہے لاہور میں آ کر سو جانے | یہی دنیا ہے جو دار المحن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام | کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے

برکھارت میں بھی وطن کی یاد اور وطن کی خوبصورت برسات اور صحبتوں کا ذکر بڑے پُر اثر اور دلکش انداز میں کیا ہے ؎

بیزار اک اپنی جان و تن سے | بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے
غربت کی صعوبتوں کا مارا | چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
غم خوار ہے کوئی اور نہ دل جو | اک باغ میں ہے پڑا لبِ جو

ابر اتنے میں اک طرف سے اُٹھا　　اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
برق آ کے لگی تڑپنے پیہم　　اور پڑنے لگی پھوار کم کم
دیکھے کوئی اُس گھڑی کا عالم　　وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم

قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا　　فرقت میں تمہاری آئے برکھا
پردیس میں سچ ہے کیا ہو دلشاد　　جب دل میں بھری ہو دیس کی یاد

تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز　　پکڑا گیا دل سُن اُس کی آواز
پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالؔی

لاہور کی آب و ہوا بھی انہیں موافق نہیں تھی اور وہاں صحت برابر خراب رہتی تھی۔ آخر انہوں نے دِلّی جانے کی صورت نکالی اور اینگلو عربک اسکول میں مُدرّس ہو کر چلے آئے۔ یہاں انہوں نے بڑی محنت، لیاقت اور دل سوزی سے طالب علموں کو کئی سال تک پڑھایا۔ جن لوگوں نے حالؔی سے درس لیا ہے وہ ہمیشہ ان کے پڑھانے کے معترف اور مداح رہے۔

دِلّی آ کر بھی حالؔی کو دلی سکون نصیب نہ ہوا۔ اب وہ ایک نئی اُلجھن اور ذہنی کش مکش میں مبتلا تھے۔ نوجوانی کا دور گزر چکا تھا۔ عشقیہ شاعری کا ولولہ سرد ہو گیا تھا۔ گل و بلبل کی داستان سے جی سیر ہو چکا تھا۔ داخلی زندگی کا وہ دور جس میں انسان صرف اپنی ذات کو دیکھتا اور خود اپنی پرستش کرتا ہے گزر گیا تھا اور اب انہوں نے ایک بہت وسیع دنیا میں قدم رکھا تھا۔ اب بجائے عشق کے روگ کے قوم کا درد ان کو ستا رہا تھا۔ ملک اور قوم کی زبوں حالی نے ان کے درد آشنا اور حساس دل پر

بہت اثر ڈالا شعروادب کا موجودہ مذاق اس نازک زمانہ میں نکمّا اور فضول معلوم ہونے لگا۔ جب جہاز ڈوب رہا ہو تو مسافروں کا چنگ و رباب پر گانا کیا بھلا معلوم ہوگا؟ حالی کو اپنا ۲۰ - ۲۲ سال کا سرمایۂ شعر بالکل نکمّا اور بے قدر نظر آیا۔ کسی برتر اور اعلےٰ کام کا ولولہ اُن کے دل میں اُبھر رہا تھا۔ شعروادب میں اصلاح، قوم کو ابھارنے کا جذبہ، انسانوں کو انسان بنانے کی تمنّا غرض مختلف جذبات تھے جو دل میں موجزن تھے مگر ابھی تک انہیں صحیح راستے کا علم نہ ہوسکا تھا کہ کدھر جائیں۔۔۔۔۔۔ اُن پر ایک افسردگی اور یاس کی کیفیت طاری تھی۔ اس زمانے کے احساسات کو انہوں نے **مسدس حالی** کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔ "بچپن کا زمانہ جو حقیقت میں دنیا کی بادشاہت کا زمانہ ہے ایک ایسے دلچسپ اور پُر فضا میدان میں گزرا جو کلفت کے گرد و غبار سے بالکل پاک تھا۔ نہ وہاں ریت کے ٹیلے تھے نہ خار وار جھاڑیاں تھیں نہ آندھیوں کے طوفان نہ بادِ سموم کی لپٹ تھی۔ جب اس میدان سے کھیلتے کودتے آگے بڑھے تو ایک اور صحرا اس سے بھی زیادہ دلفریب نظر آیا جس کے دیکھتے ہی ہزاروں ولولے اور لاکھوں امنگیں خود بخود دل میں پیدا ہوگئیں مگر یہ صحرا جس قدر نشاط انگیز تھا۔ اُسی قدر وحشت خیز بھی تھا۔۔۔۔۔۔ باغِ جوانی کی بہار اگرچہ قابلِ دید تھی۔ مگر دنیا کے مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی۔ نہ خود آرائی کا خیال آیا اور نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی۔ نہ وصل کی لذّت اٹھائی نہ فراق کا مزا چکھا۔

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشتِ جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کردیا۔۔۔۔۔۔ بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اُسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کرچکے جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں

سے چلے تھے وہیں ہیں...... نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدانِ وسیع نظر آیا جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لئے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں. مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین تک محدود رہی ہو اُن سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا. اس کے سوا بیس برس کی بے کار اور نکمّی گردش میں ہاتھ پاؤں چور ہو گئے تھے. اور طاقتِ رفتار جواب دے چکی تھی لیکن پاؤں میں چکّر تھا۔ اس لئے نچلا بیٹھنا بھی دشوار تھا۔"

آخر خدا نے حالی کو اس ذہنی کشمکش سے نکالنے کے لئے ایک مردِ بزرگ و دانا کو بھیجا۔ جس مردِ خدا نے مسلمانوں کی ڈوبتی کشتی کو پار لگایا تھا، حالی کو بچانے کا سہرا بھی اُسی کے سر رہا۔

"ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے ایک دشوار گزار رستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اُس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں بہت سے ابھی اُس کے ساتھ افتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں. مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں، پیروں میں چھالے پڑے ہیں...... لیکن وہ اولوالعزم آدمی جوان سب کا رہنما ہے اُسی طرح تازہ دم ہے۔ نہ اُسے رستے کی تکان ہے نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پروا ہے نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے۔ اُس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہوا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اُس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اُس کی ایک نگاہ اِدھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی. بیس برس کے تھکے ہارے، خستہ و کوفتہ اُسی دشوار گذار رستے پر پڑ لئے......

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں　　دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے"

غرض حالی کی سرسیّد سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کی زبردست شخصیت ان کی مضبوط سیرت اور سب سے زیادہ ان کے بلند مقصد سے بے حد متاثر ہوئے اور دل وجان سے سرسیّد کے ساتھ ہوگئے اور اپنی باقی ۳۸ سالہ زندگی کا ہر سانس اس مقصد کے لئے وقف کر دیا کہ اپنی خواب غفلت میں سرشار قوم کو جگانا اور اُسے ترقی کے راستے پر چلنا سکھانا ہے ..... اُس کے بگڑے مذاق کو سنوارنا اور گرے ہوئے اخلاق کو پھر سے بلند کرنا ہے۔

"زمانہ کا نیا ٹھاٹ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہوگیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ ...... قوم کے ایک سچے خیرخواہ نے ...... آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے .... عزیز ذلیل ہوگئے، شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہوچکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے، اخلاق بگڑ گئے ہیں۔ اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہے .... ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں۔ اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے ہرچند لوگ بہت کچھ لکھ رہے اور لکھ چکے ہیں۔ مگر نظم جو بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصّہ ہے۔ قوم کے بیدار کرنے کے لئے اب تک کسی نے نہیں لکھی ......"

سرسیّد کی اس تحریک نے حالی کے دل پر جادو کا سا اثر کیا اور انہیں کے الفاظ میں "ہرچند کہ اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اُٹھانا دشوار تھا، ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی، دل ہی سے نکلی تھی دل

میں جا کر ٹھہری - برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا، باسی کڑھی میں اُبال آیا، افسردہ دل اور بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، انہیں سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی ..."

اور باوجود ساری فکروں اور پریشانیوں کے حالیؔ نے اس نئی دھن کو نہ چھوڑا۔ انہوں نے دل اور دماغ کی بہترین قوتوں سے کام لے کر وہ مشہور و معروف نظم تصنیف کی جس نے نہ صرف مسدس **حالی** کے امر نام سے ادب میں اپنے لئے ایک مخصوص مقام پیدا کیا بلکہ سارے ملک بالخصوص مسلمانوں میں ایک ہلچل ڈال دی۔ اس کتاب کی ایک جلد حالیؔ نے اپنے عزیز اور محترم دوست سر سید کے پاس بھیجی۔ سر سید کے دل پر اس کے پڑھنے سے جو اثر ہوا اُس کو انہوں نے بڑے دلکش انداز میں اپنے خط میں بیان کیا ہے جو باوجود اکثر دہرایا جانے کے اس قابل ہے کہ اُس کو یہاں نقل کیا جائے۔ "جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہولی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر مسدس کی بدولت فنِ شاعری کی تاریخِ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے ..... کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایۂ ناز شعراو شاعری ہے بالکل مبرا ہے کیوں کر اس خوبی اور خوش بیانی اور موثر طور پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشمِ نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے ...... بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اُس کو میں اپنے ان اعمالِ حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالیؔ سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں ....."

نقادوں نے مسدسِ حالیؔ کی بڑی تعریف کی ہے لیکن سر سید کا اندازِ بیان

اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ایک دردمند شاعر کے دل کی لگن کو ایک سچے سخن فہم اور درد آشنا انسان نے سمجھا اور ایک اچھوتے اور دل نشیں انداز میں اُس کی داد دی۔

سب سے پہلے سرسید کے اخبار "تہذیب الاخلاق" میں مسدس حالی کو قسط وار چھاپا گیا۔ کتاب کی شکل میں وہ بعد میں شائع ہوئی۔

مسدس کی مخالفت بھی اتنے ہی زور شور سے کی گئی جس طرح تعریف اور اکثر اخباروں نے مسدس کے خلاف مہینوں برسوں اپنے صفحات سیاہ کیے لیکن مخالفت اور تعصب کا یہ طوفان چھٹ گیا اور مسدس جس مقام پر تھا وہیں رہا۔ غرض اس طرح بقول ڈاکٹر عابد "سرسیّد کی بدولت قوم کو شاعر مل گیا اور شاعر کو قوم" اور اس کے بعد سے حالی کی زندگی اور ان کی شاعری تمام تر قومی خدمت کی نذر ہوئی۔

اس مرتبہ حالی تقریباً بارہ برس دلّی میں مقیم رہے۔ اور اس دوران میں علاوہ سرسیّد کا ہاتھ بٹانے اور علی گڑھ کالج کی ہر ممکن مدد کرنے (جس کا تفصیلی ذکر آگے آئیگا) وہ تصنیف و تالیف کے کام میں بھی کافی وقت صرف کرتے رہے۔ حیاتِ سعدی اسی زمانے کی تصنیف ہے۔

۱۸۸۶ء میں خواجہ امداد حسین بیمار ہو کر علاج کے لئے دلّی آئے اور وہ حالی کے پاس ٹھیرے۔ پانچ چھ مہینے تک انتہائی کوشش اور لگن کے ساتھ حالی اپنے بھائی کا علاج کراتے رہے مگر ساری کوششیں بے کار گئیں اور ان کو بھائی کی جدائی کا داغ سہنا پڑا ...... حالی کے دل پر اس سانحے کا اثر بہت سخت ہوا۔ انہیں اپنے بھائی سے بڑی گہری محبت اور دلی عقیدت تھی۔ انہوں نے اپنے بھائی کے انتقال پر جو چند شعر کا مرثیہ کہا ہے وہ دلی درد اور غم کا آئینہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل کی ایک ایک کیفیت بے اختیار شعر میں ڈھلتی چلی جا رہی ہے ؎

آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے ۔۔۔ موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی

پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی ۔۔۔ غم بھائی کا مرجانے کی ہے اس کے نشانی

جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا ۔۔۔ سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی

جس بھائی کی آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا ۔۔۔ جس بھائی کے سایہ میں کٹی اُس کی جوانی

شفقت نے دیا جس کی بُھلا مہر پدر کو ۔۔۔ دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی

جیتا بھی رہا بھائی گر اس بھائی کے پیچھے ۔۔۔ لذّت نہیں جینے کی نصیب اُس کے اٹھانی

دل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو! ۔۔۔ کیا ڈھونڈتے ہو اُس کی طبیعت میں روانی

باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر ۔۔۔ ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

لیکن حالی کے دل پر جو کچھ بھی بیتی ہو انہیں تو ایک اعلےٰ مقصد کی خدمت کرنی تھی۔ اس لئے انہوں نے جوں توں اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر قومی اور ادبی خدمت میں لگ گئے۔

۱۸۸۷ء میں نواب آسماں جاہ جو ریاست حیدر آباد کے وزیر اعظم تھے۔ علی گڑھ آئے اور سر سیّد نے حالی کا اُن سے تعارف کرایا۔ سر آسماں جاہ حالی کے کمالِ شاعری اور اُن کے علم و فضل سے واقف تھے۔ اُن سے مل کر اُن کی بے مثل سیرت اور شخصیت کو دیکھ کر اور بھی متاثر ہوئے اور انہوں نے پرکھ لیا کہ ایسی غیر معمولی قابلیّت کے آدمی کا فکرِ معاش میں پریشان رہنا بڑا زبردست قومی نقصان ہے چنانچہ انہوں نے ریاست حیدر آباد کی طرف سے، جہاں علم و ادب کی سرپرستی کی روایت چلی آتی تھی، امدادِ مصنّفین کے صیغے سے پچھتر روپے ماہوار کا وظیفہ حالی کے نام جاری کرا دیا۔ یہ رقم آج حقیر معلوم ہو لیکن اس زمانے میں ایک متوسط حیثیت کا آدمی جس کو عیش و آرام کی فکر نہ ہو اس میں گذارہ کر سکتا تھا۔ در اصل حالی سے سر سیّد نے پوچھا تھا کہ آپ کے لئے کتنا وظیفہ مقرر کیا جائے تو انہوں نے وہی رقم بتائی جو انہیں عربک

اسکول سے ملتی تھی۔

حالی علمی آدمی تھے۔ ادبی مذاق رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت کو نوکری سے ذرا بھی مناسبت نہ تھی۔ مگر اس زمانے میں کیا آج بھی ہمارے دیس میں کوئی آدمی محض علم و ادب کی خدمت کر کے گزرا نہیں کر سکتا۔ حالی مجبوراً ملازمت کا ناپسندیدہ کام کرتے رہے تھے تاکہ خاندان کی کفالت کر سکیں۔ حیدر آباد کے اس وظیفے کو انھوں نے امداد غیبی سمجھا اور اس پر قناعت کر کے ملازمت سے استعفا دیدیا اور اس اطمینان کے ساتھ جو صاحبانِ استغنا کا حصّہ ہے۔ وہ علمی ادبی خدمت میں مشغول ہو گئے۔

اینگلو عربک اسکول کی ملازمت ترک کرنے کے بعد بھی ممکن تھا کہ حالی دلّی ہی میں رہتے۔ کیونکہ انہیں اپنے وطن سے زیادہ اس شہر سے محبّت تھی۔ مگر اب دلّی اُن کے لئے ویرانے سے کم نہ تھی۔ اُن کے قدیم دوست اور رفیق، سخن فہم اور سخن سنج ساتھی، ہم نوا شاعر سب ایک ایک کر کے داغِ مفارقت دے چکے تھے اور اُن کی ذہنی کیفیت کا نقشہ یہ تھا۔

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیّر باقی | وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزم یاراں سمجھو | یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

اپنی ایک مشہور غزل میں، جسے نظم مسلسل کہنا زیادہ مناسب ہے، دلّی کا مرثیہ ایسے چبھتے انداز سے سنایا ہے کہ پڑھنے والے کے دل پر چوٹ پڑتی ہے۔

جتنے رہتے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق | آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز
کوچ سب کر گئے دلّی سے ترے قدر شناس | قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز
تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ | نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز
ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب | دردِ انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی | کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی، صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانا ہرگز

غرض حالی نے بادلِ پُر درد دلی کو الوداع کہی اور اس کے بعد مستقل طور پر اپنے وطن پانی پت میں رہنے لگے۔

اُن کا قدیم مکان محلہ انصار میں تھا۔ مگر وہ اس میں رہنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک تو وہ وسطِ شہر میں تھا جہاں لوگ ملنے جلنے کے لئے بہت زیادہ آتے تھے اور حالی کو سکون سے کام کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ دوسرے اس میں اُن کی بھاوج رہتی تھیں اور اکثر ان کی بڑی بہو اور ان کے بچے آکر رہا کرتے تھے۔ چنانچہ اپنے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کے مشورے سے (جو بی اے کر کے پنجاب کے محکمۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے تھے) انھوں نے یہ طے کیا کہ محلہ سادات میں جو اسٹیشن سے نسبتاً دور اور حالی کا ننھیالی اور سسرالی محلہ تھا ایک مکان بنوایا جائے۔ زمین موجود تھی، اُس پر ایک چھوٹا سا مکان بھی تھا۔ اُسے تڑوا کر اپنی ضرورت اور آرام کے مطابق مکان بنوانا تھا۔ اس کے لئے سب سے بڑا سوال روپے کا تھا۔ لیکن اقلیم شاعری کے اس تاجدار کے پاس روپیہ کہاں؟ یہ ضرور ہے کہ آج کل کے مقابلے میں اس وقت تعمیر میں بہت کم لاگت آتی تھی۔ پھر بھی روپیہ کتنا ہی کم لگے پر جمع کرنے ہی سے جمع ہو سکتا ہے۔ حالی کے پاس تھا ہی کیا سوا حیدرآباد کے پچھتر روپے ماہوار کے جس سے ان کا خرچ تو چل جاتا تھا مگر کچھ پس انداز نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن خواجہ سجاد حسین نے طے کر لیا تھا کہ اپنے والد محترم کے آرام کے

لئے مکان ضرور بنوائیں گے۔ اُن کی تنخواہ اچھی خاصی تھی۔ مگر وہ بہت فیاض اور شاہ خرچ واقع ہوئے تھے۔ تاہم وہ برابر کچھ نہ کچھ روپیہ تعمیرِ مکان کے لئے بھیجتے رہے اور اس طرح تھوڑا تھوڑا کرکے مکان بنتا رہا اور آخر کار ۱۸۹۶ء میں تیار ہو گیا۔ اس میں نیچے پرانی قسم کا زنانہ مکان تھا یعنی دالان، سہ دریاں، صحنچیاں، کوٹھریاں اور صحن چبوترہ وغیرہ۔ اوپر ایک خاصا بڑا ہوادار کمرہ، غسل خانہ اور دوسری طرف ایک نسبتاً چھوٹا کمرہ تھا۔ اوپر کا حصہ دیوان خانہ تھا جس میں بڑے کمرے میں مولانا حالی رہتے تھے۔ آنے جانے کے لئے ایک زینہ اندر گھر میں جاتا تھا دوسرا باہر دالانے میں نکلتا تھا۔ مرد باہر سے باہر اوپر آجا سکتے تھے۔ مولانا حالی کے ملازم نانوں خاں اور عطا اللہ ان کے ساتھ اوپر ہی رہتے تھے اور وہیں ان کا حقہ بھرنے اور چاء بنانے کا انتظام تھا۔ صبح شام کھانے کے وقت نیچے زنانہ مکان میں آتے تھے جہاں اُن کی بیوی، بیٹی اور اُن کا چھوٹا نواسہ رہتے تھے اور وہیں خاندان بھر کے عزیز ملنے کے لئے آتے رہتے تھے۔

حالی اپنے نئے مکان میں اُٹھ آئے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ سکوں اور خاموشی سے علمی ادبی کام کرنے کا موقع ملے لیکن فرصت اور اطمینان بہت کم نصیب ہوتا تھا۔ علاوہ گھر کی فکروں اور خاندانی پریشانیوں کے جن سے انہیں بحیثیت ایک فرض شناس اور شفیق سردارِ خاندان کے نبٹنا پڑتا تھا، اور بھی بہت سے متفرق کام اور مصروفیتیں انہیں چین نہ لینے دیتی تھیں۔ علی گڑھ کالج کی امداد کے سلسلے میں لمبے لمبے سفر کرنا، تعلیمی کانفرنسوں میں شرکت کے لئے جانا، دوستوں عزیزوں اور عقیدت مندوں کے اصرار پر ان کے ہاں جانا، علی گڑھ میں علمی ادبی جلسوں میں جاکر شرکت کرنا۔ غرض اس قسم کے بہت سے سفر انہیں کرنے ہوتے تھے جس میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔

۱۸۹۱ء میں سرسید کے ساتھ حیدر آباد بھی گئے اور علی گڑھ کالج کے لئے اُمید سے

زیادہ چندہ لے کر واپس آئے۔ اسی زمانہ میں حیدر آباد سے جو وظیفہ ان کو ملتا تھا وہ ۷۵ روپے سے بڑھا کر سو روپے کر دیا گیا تھا۔

بہرحال ان سب مصروفیتوں کے باوجود وہ اپنے ادبی کاموں کے لئے وقت نکال ہی لیتے تھے۔ مقدمہ شعر و شاعری، یادگارِ غالب، بہت سے مختصر مضامین اور سرسیّد کی ضخیم سوانح عمری حیاتِ جاوید یہ سب دلّی سے واپس آ کر ہی لکھی گئی تھیں۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں جب کہ حالی بہت توجہ اور انہماک سے حیاتِ جاوید مرتب کر رہے تھے دفعتاً اُن کی رفیقِ حیات کا ہیضے سے انتقال ہو گیا۔ یہ بڑی باسلیقہ، منتظم، ہمدرد، فیاض اور خدمت گذار خاتون تھیں۔ تقریباً نصف صدی کی مشترک زندگی میں حالی کی اور ان کی اَن بن نہیں ہوئی۔ نہ انہوں نے کبھی اپنے شوہر کے علمی اور قومی زندگی کی مصروفیتوں میں کوئی رکاوٹ پیدا کی جیسا کہ بعض اہلِ علم کی بیویاں کیا کرتی ہیں۔ البتہ وہ بڑے تیز مزاج کی تھیں اور جب غصہ آتا تھا تو آپے سے باہر ہو جاتی تھیں (لیکن پھر بڑی جلدی پشیمان بھی ہو جاتی تھیں)۔ برخلاف اس کے حالی کا مزاج اتنا ہی نرم واقع ہوا تھا۔ اس لئے کبھی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آتی تھی۔

یہ آج سے پون صدی پہلے کا زمانہ تھا جب میاں بیوی کی زندگی کے دو بالکل الگ الگ دائرے ہوا کرتے تھے۔ بیوی اپنے گھر کی چھوٹی سی سلطنت کی ملکہ اور شوہر اپنی زندگی اور اپنے وقت کا مالک تھا اور وہ اُسے جیسے چاہتا صرف کرتا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ دونوں کے کچھ مخصوص فرائض بھی ہوتے تھے۔ بیوی کا کام تھا کہ وہ گھر کا انتظام، خاندان کی دیکھ بھال، بچّوں کی پرورش اور شوہر کی خدمت کرے۔ میاں کا فرض تھا کہ وہ بیوی کے لئے خرچ مہیّا کرے اور اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھے۔ باہر کے تمام معاملات کو سمجھے اور سلجھائے۔ آپس میں کتنی ہی محبّت ہو لیکن وہ دل میں پوشیدہ رکھی جاتی تھی۔ کسی طرح بھی اس کا اظہار کرنا

معیوب اور وضع داری کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

حالی اسی دور کے لوگوں میں سے تھے۔ اس لئے یہ ثابت کرنا مشکل ہے۔ کہ انہیں اپنی بیوی سے ایسی محبت تھی جیسی آج کل کی جاتی ہے (یا ظاہر کی جاتی ہے)۔ ہاں اُس زمانے کے معیار سے پرکھا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کی ازدواجی زندگی کامیاب تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے اور اپنے اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا کرتے تھے۔ دونوں کی زندگی کے دھارے الگ الگ تھے لیکن کہیں نہ کہیں آکر مل بھی جاتے تھے۔

بی اسلام النساء کبھی اپنے شوہر کے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ڈالتی تھیں۔ وہ جہاں چاہیں رہیں جو چاہے کریں وہ دخل نہ دیتی تھیں۔ اور گھر کی ساری فکریں اور پریشانیاں، ساری ذمہ داریاں بھی، جس حد تک پرانے زمانے کی کوئی عورت اُٹھا سکتی ہے، نہایت خوش اسلوبی سے اٹھاتی تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے حقوق سے جَو بھر دست بردار نہ ہوتی تھیں۔ اور اگر شوہر کی کوئی بات ناگوار ہوتی تو اُس کے اظہار میں ذرا سا تامل نہ کرتیں۔ خواجہ غلام السبطین مرحوم نے اپنی (غیر مطبوعہ) ڈائری میں اسی قسم کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ایک مرتبہ محرم کی نو تاریخ کو حالی اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور اپنے سالے میر فیاض حسین کے ساتھ کہیں تانگے میں بیٹھ کر گئے۔ بیوی کو حالی کی یہ بات سخت ناگوار گذری (واضح رہے کہ حالی سنی تھے اور بیوی شیعہ اور اس خاندان میں انتہائی رواداری تھی اور اس قسم کی شادیاں بلا تامّل ہوتی تھیں) اتفاق سے تانگہ الٹ گیا۔ جب یہ لوگ واپس آئے تو سیدانی کا جلال انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ انہوں نے میاں، بیٹے اور بھائی کو دل کھول کر بُرا بھلا کہا کہ نبیؐ کے نواسے پر تو قیامت کا وقت پڑ رہا ہے، اُن کے بچے بھوک پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور تم سواریوں میں بیٹھے سیر کر رہے ہو۔ اچھا ہوا تانگہ اُلٹ گیا وغیرہ وغیرہ۔ میر فیاض حسین

اور خواجہ سجاد حسین کو یہ بات ناگوار گذری کہ مولانا کو ایسی سخت باتیں کہی جائیں لیکن فرشتہ منش حالی نے صرف اتنا کہا "سیدانی غصے میں ہے اور حق پر۔ غلطی ہماری ہی تھی کہ آج کے دن سواری پر بیٹھے۔ وہ جو کہتی ہیں بجا ہے"

خواجہ سجاد حسین کی بیوی، اُن کے ماموں کی بیٹی تھیں اور وہ بھی اپنی پھوپی اور باپ کی طرح تیز مزاج تھیں اور ساس بہو میں اکثر نوک جھوک ہوتی رہتی تھی۔ حالی اوپر کے کمرے میں بیٹھے لکھتے ہوتے اور یہ ساری باتیں سنتے مگر ایک لفظ نہ بولتے۔ بیوی کا بہت خیال کرتے تھے اور بہو کو بھی بہت چاہتے تھے۔ اکثر ان ہی جھگڑوں میں شام ہو جاتی تو وہ اپنا کام ختم کر کے اٹھتے اور کمرے کی کھڑکی کھول کر مسکراتے ہوئے شیریں لہجے میں جھک کر کہتے "بس بی بس...... اب تو شام بھی ہو گئی۔ اب تو لڑائی تغاری (مٹی کا کونڈا جسے پانی پت میں تغاری کہتے تھے) کے نیچے دبا دو۔ اس وقت تو بھٹیاریاں بھی نہیں لڑتیں"

حالی نجی خطوں میں اکثر اپنی بیوی کا ذکر کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اُن کا کس قدر پاس تھا۔ بیٹوں، بھتیجوں، پوتیوں وغیرہ کو اُن کی طرف سے خاص طور پر سلام و پیام، دعا پیار اور اُن کی صحت کا حال لکھتے اور اُن کو باقاعدہ خط لکھتے رہنے کی تاکید کرتے۔ ہر خط میں کسی نہ کسی طرح اُن کا ذکر ضرور آتا ہے۔ اُن کا ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے بدلے میں حالی اور خواجہ سجاد حسین ایک دکان لینا چاہتے تھے۔ مگر یہ تجویز مولانا کی بیوی کو پسند نہ تھی۔ اس بارے میں انہوں نے کئی خطوں میں بیٹے کو لکھا کہ بغیر ان کی مرضی کے دکان نہیں لینی چاہیئے۔ "اگرچہ مناسب تو یہی تھا مگر مستورات کی بغیر مرضی کے تبادلہ نہیں ہو سکتا، خصوصاً تمہاری والدہ اس کے بہت خلاف ہیں"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "تمہاری والدہ اب اچھی ہیں اور کمزوری کے

باوجود گھر کا سارا کام کاج کیے جاتی ہیں "

"تمہاری والدہ نے باوجود کمزوری کے سب روزے رکھے اور باوجود اس کے سارا کام اگلے اور پچھلے کو خود کرتی رہیں "

شادی بیاہ، نسبت ناتے اور ہر قسم کے اہم کام جو اولاد اور اولاد کی اولاد سے متعلق ہوتے ان میں حالی کی رائے سے زیادہ اُن کی بیوی کی رائے کو اہمیت حاصل تھی۔ حالی کو جو وظیفہ ملتا تھا وہ سارے کا سارا بیوی کے ہاتھ میں دے دیتے اور پھر اس کے بارے میں الٹ کر نہیں پوچھتے تھے۔ اُن کے ذاتی خرچ کے لئے زیادہ تر خواجہ سجاد حسین اُن کو کچھ روپے بھیج دیتے تھے۔

اُن کے انتقال پر مولانا حالی نے خواجہ سجاد حسین کو جو اطلاعی اور تعزیتی خط لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں اپنی بیوی کی کتنی قدر تھی۔

"پرسوں تمہاری والدہ کو دس بجے رات کے اس کا (ہیضے کا) اثر ہوا اور کل نو بجے رات انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اگرچہ اس حادثہ ناگہانی سے جو صدمہ سب عزیزوں اور متعلقوں اور ہمسایوں اور راہ چلتوں کو ہوا ہے اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی اولاد کو سب سے زیادہ صدمہ ہوا ہے اور ہو گا۔ مگر میری جان والدین کا اولاد کے سامنے گزر جانا والدین کی خوش نصیبی اور اولاد کا قدیم ورثہ ہے۔ تمہاری والدہ کی جیسی عمدہ زندگی اور عمدہ موت ہوئی ہے اُس کی ہر شخص کو تمنا ہونی چاہیئے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے سعادت مند اولاد چھوڑی ہے۔ اور ان کو بفضلہٖ تعالیٰ اچھی حالت میں چھوڑا ہے۔ ایک زمانے کو اپنا مداح اور ثناخواں اور شکر گذار چھوڑا ہے۔ وہ اپنی حقیقی اور اصلی نیکیوں کی تمام عشیرہ میں ایک عمدہ مثال تھیں۔ انہوں نے ہر ادنیٰ اور اعلیٰ کی خدمت گزاری سے مخدومیت کا درجہ حاصل کیا تھا۔ آخر وقت میں جب تک ان کو ہوش رہا برابر خدا کی اُن کے وردِ زبان

رہی۔ جس شخص کی ایسی عمدہ زندگی اور ایسی عمدہ موت ہو اُس سے زیادہ کون خوش نصیب ہو سکتا ہے"

حالی کا ضبط دیکھئے کہ ذکر محض مرحومہ کی خوبیوں کا ہے۔ اپنے رنج و غم کے بارے میں ایک حرف نہیں۔ پھر بھی اس کے ایک ایک لفظ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ حالی کی بی بی کیسی اعلےٰ سیرت کی مالک تھیں اور حالی کے دل میں ان کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ حالی کو بیٹوں کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں سخت رنجیدہ ہیں تو کس طرح صبر کی تلقین کہتے ہیں: "تم کو چاہیئے کہ اپنی والدہ کی محبت اور خوبیوں کو بہت مت یاد کیا کرو اور اس دعا کا ورد رکھو" الٰہی مجھے اپنی محبت اپنی جان سے اور اپنے کنبے سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ دے"۔ خدا ہم سب کو اپنی محبت عنایت کرے کہ یہی ہر ایک رنج و غم کا بہترین علاج ہے"

اس سے کچھ پہلے اُن کے عزیز دوست اور مرشد سر سید کا جن سے انہیں بہت گہری عقیدت اور محبت تھی انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی وفات کا جیسا سخت صدمہ حالی کو ہوا ہوگا اُس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ مگر یہ صدمے بھی انہیں بے کار اور پامال نہ کر سکے بلکہ وہ اور زیادہ لگن اور محنت کے ساتھ اپنے کام میں لگ گئے تاکہ وہ دنیا کو دکھائیں کہ اس بے مثل انسان نے کس طرح قوم کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے میں اپنی زندگی صرف کی اور اس مقصد کے لئے ہر قسم کا ایثار خوشی کے ساتھ گوارا کیا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں تقریباً ہزار صفحے کی یہ ضخیم کتاب حیاتِ جاوید تیار ہو گئی جس نے ایک طرف سر سید کے کام کو جاودانی بنایا اور دوسری طرف اس خاص شعبۂ ادب میں حالی کے نام کو امر بنا دیا۔

حالی طبعاً گوشہ نشین اور تنہائی پسند تھے۔ نام نمود اور شہرت سے گھبراتے تھے پھر بھی ان کی علمی اور ادبی خدمات اس قدر اہمیت رکھتی تھیں کہ سارا ملک ان کا

معترف اور مداح تھا۔ ۱۹۰۴ء میں حکومت نے بغیر کسی تحریک یا کوشش کے اُن کی قابلِ قدر خدمات کے اعزاز میں حالی کو شمس العلماء کا خطاب پیش کیا جو اُس وقت واقعاً بڑے بڑے عالم فاضل لوگوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس پر تمام علمی و ادبی حلقوں میں خوشی منائی گئی اور مولانا کے پاس سارے ملک سے سینکڑوں مبارک باد کے خط آئے۔ ان میں مولانا شبلی کا خط سب سے مختصر تھا۔ مگر انہوں نے ایک ہی جملے میں اپنی پوری عقیدت اور احترام کا اظہار کر دیا۔ "مولانا! آپ کو تو نہیں لیکن خطاب شمس العلمائی کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اب جاکر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی!" اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مولانا شبلی اکثر مولانا حالی پر اعتراض بھی کرتے تھے۔ حیاتِ جاوید پر انہوں نے خاص طور پر سخت تنقید اور اعتراض کئے تھے اور اُسے سر سید کی "مدلل مداحی" قرار دیا تھا۔ لیکن اس میں دیانت دارانہ اختلاف رائے اور ادبی چشمک دونوں کو دخل تھا جس کا عالی ظرف حالی نے کبھی خیال نہیں کیا۔ اور شبلی بھی اس چشمک کے باوجود حالی کی سیرت اور شخصیت سے بہت متاثر اور ان کے بڑے مداح تھے۔

حالی کو خطاب ملا تو انہیں بجائے خوشی کے اُلجھن سی محسوس ہوئی۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جس شخص کو گورنمنٹ خطاب سے "سرفراز" کرتی تھی اُسے ہر دربار اور دوسری سرکاری تقریبوں میں حاضری دینی اور حکام کی پذیرائی کرنی پڑتی تھی۔ حالی ان چیزوں سے گھبراتے تھے۔ خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں۔ "اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہمارے بہت سے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں اور اس کے لئے ریشہ دوانیاں کرتے ہیں۔ مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہیں ملتا تھا اور ایسے مواقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آوے گا یا کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل

کر آوے گا۔ لامحالہ وہاں جانا پڑے گا......بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں؟"

۱۹۰۵ء میں نظام حیدر آباد کی چہل سالہ سالگرہ کے جشن میں مولانا حالی کو بلایا گیا۔ حالی باوجود پیرانہ سالی اور ضعیفی کے وہاں گئے اور چھ مہینے تک وہاں قیام کیا۔ اس زمانے میں اُن کی وہاں کے بہت سے لوگوں سے ملاقات ہو گئی۔ یہ حالی کی سیرت کی خصوصیت تھی کہ جو ایک مرتبہ اُن سے مل لیتا تھا ہمیشہ کے لئے گرویدہ ہو جاتا تھا۔ جب مولانا وہاں سے واپس آنے لگے تو اہلِ حیدر آباد نے ایک سپاس نامہ ان کی خدمت میں پیش کیا جس میں انہوں نے اپنی دلی عقیدت اور ارادت کا اظہار کیا تھا۔ یہ سپاس نامہ ریشم پر چھپا ہوا ہے اور حسنِ اتفاق سے میرے پاس موجود ہے۔ اس کے چند جملوں سے اندازہ ہوگا کہ حالی کی شخصیت نے جو ہر قسم کی شہرت اور "اشتہار بازی" سے پرہیز کرتی تھی، لوگوں پر کیا اثر پیدا کیا تھا۔

"اہلِ حیدر آباد کے لئے یہ کچھ کم باعثِ فخر و عزت نہیں کہ آپ جیسا فاضل، صاحبِ دل اور ہمدردِ بنی نوعِ انسان اس شہر میں آئے، چندے قیام کرے اور لوگوں کو اپنی صحبت سے مستفیض کرے۔ آپ کے احسانات ہمارے ملک اور قوم پر ایسے نہیں کہ وہ ہمارے شکریہ کے محتاج ہوں۔ بلکہ وہ ہم پر ایسے چھائے ہوئے ہیں کہ اُن کے شکریئے سے عہدہ برآ ہونا ہماری طاقت سے باہر ہے۔......اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ سر سید کے مشن کو آپ سے زیادہ کسی سے مدد نہیں ملی۔ آپ زیادہ تر ہمارے شکریئے کے اس لئے بھی مستحق ہیں کہ جب سے آپ نے قلم اٹھایا کبھی کوئی تصنیف اپنی ذاتی منفعت کے لئے نہیں کی بلکہ محض ملک کی بہبودی اور فلاح کے لئے......اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ آپ نے ہمیشہ ایسے مضمون پر قلم اٹھایا جس کا اثر، فائدہ اور دلچسپی لازوال ہے۔ مجالس النساء سے لے کر حیاتِ جاوید تک اور مسدس حالی سے لے کر چپ کی داد تک آپ کی کل تصانیف حبِ وطن اور فلاحِ قوم سے بھری ہوئی ہیں۔

آپ نے ملک کے تمدّنی اور اخلاقی حالت پر وقتاً فوقتاً جو پر دَرد نظمیں اور نثریں لکھی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ملک کے حالات کو کیسی غائر نظر سے دیکھا ہے۔ اور اُس کی فلاح و بہبود کا کس قدر خیال ہے ۔ ...... خاص کر آپ نے بے زبان فرقہ نسواں کی چپ کی جو داد دی ہے وہ نہایت قابلِ تحسین اور لائقِ شکر ہے۔ آپ کی دَرد انگیز اور دل کو ہلا دینے والی مثنوی مناجاتِ بیوہ اور آخری نظم چپ کی داد ہمارے قول کی شاہد ہیں۔

علمی اور دماغی قابلیتوں کے علاوہ ہم آپ میں ایک اور بے بہا خوبی پاتے ہیں۔ جس کا ذکر اس موقع پر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ آپ کا وسیع اخلاق اور صلح کل مشرب ہے۔ آپ کی تمام تصانیف میں کہیں تعصب کی بو نہیں پائی جاتی .... آپ نے سب فرقوں اور سب مذہبوں اور سب طبقوں کو ایک نظر سے دیکھا ہے۔ خوش اخلاقی اور بے تعصّبی کے سوائے آپ میں سچّی انسانی ہمدردی، انکسار، محبّت اور ایثار ایسی خوبیاں ہیں جو خدا اپنے برگزیدہ لوگوں اور خاص بندوں کو عطا فرماتا ہے۔ اس کا جو پاک اثر اوروں پر پڑتا ہے وہ ہزار ہا اخلی کتب کے مطالعے سے بڑھ کر ہے ......"

مولانا حالی چھ مہینے حیدر آباد میں گذار کر واپس آگئے لیکن حیدر آباد والوں کی محبت ان کے دل میں باقی رہی۔ ۱۹۰۸ء میں حیدر آباد میں سخت سیلاب آیا جس نے ہزاروں گھر تباہ کر دیئے۔ حالی نے جب یہ خبر سنی تو بے قرار ہو گئے۔ اُس زمانے کے کئی خطوں میں نوجوان دوست عبدالحق (ڈاکٹر مولوی عبدالحق) سے نام بنام ایک ایک دوست اور اپنے ایک ایک جاننے والے کی خیریت دریافت کرتے تھے۔ مصیبت زدوں کی تکلیف کے خیال سے خود اُن کے دل میں رنج و درد کا سیلاب اُمنڈ آیا تھا۔

پانی پت ایک معمولی سا قصبہ تھا جس میں نہ نئی طرز کے انگریزی اسکول تھے اور نہ کوئی لائبریری جس سے اہلِ علم و ذوق حسب ضرورت کتابیں نکلوا کر پڑھ سکیں مولانا

حالی نے اس کمی کو محسوس کیا اور ۱۹۰۵ء میں ملکہ وکٹوریہ کی وفات کے موقع پر ان کی یادگار کو بہانہ بناکر شہر کے لوگوں سے چندہ جمع کیا۔ پہلے ارادہ تھا کہ اس روپے سے اسکول کھولا جائے مگر چندہ بہت کم یعنی صرف دو ہزار ہو سکا جس میں کسی اسکول کا قیام ممکن نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اس سے ایک لائبریری قائم کی اور پانی پت کے وسط میں ایک پرفضا ٹیلے کے اوپر یہ لائبریری بنائی اور بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں منگا کر اس میں جمع کیں۔ ۱۹۴۷ء تک یہ لائبریری قائم تھی۔ اب خدا جانے باقی ہے یا زمانے کی گردش نے اُسے بھی تباہ کر دیا!

اسکول قائم کرنے کی تمنّا اس وقت تو پوری نہ ہو سکی۔ مگر چند سال بعد خواجہ سجاد حسین کی کوشش سے ایک چھوٹا سا لڑکوں کا اسکول قائم ہو گیا تھا جو بعد میں ہائی اسکول تک ترقی کر گیا تھا اور حالی مسلم ہائی اسکول کے نام سے مشہور تھا۔ ۱۹۴۷ء کی قیامت میں حالی کی یہ یادگار بھی تعصب و فساد کی نذر ہو گئی۔

مولانا حالی کی آنکھیں عرصے سے کمزور ہوتی جا رہی تھیں مگر کام کی کثرت اتنا موقع نہ دیتی تھی کہ علاج کی طرف توجہ کریں۔ حیدر آباد سے واپس آنے کے تھوڑے دن بعد ہی ان کی داہنی آنکھ میں پانی اُتر آیا اور اُس کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کا کام بالکل رک گیا۔ خواجہ غلام السبطین، اور اُن کی بھاوج (اہلیہ غلام الثقلین) بہت مصر تھے کہ ان کے پاس لکھنؤ آکر آنکھ کا آپریشن کرائیں۔ مگر مولانا کو اس لئے تامل تھا کہ وہ خود کمزور تھیں اور ان کے بچے چھوٹے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بیماری، تیمارداری اور مہمانداری کا بار ان پر پڑے۔ واقعہ یہ ہے کہ دوسروں کی تکلیف اور آرام کا خیال ان کی فطرت میں شامل تھا۔ غرض بہت دن اسی سوچ بچار اور اُلجھن میں گزرے۔ اس اثناء میں دوسری آنکھ کی روشنی بھی کم ہونی شروع ہو گئی۔ آخر پٹیالہ کے راجندر ہاسپٹل میں آنکھ کا آپریشن کرایا گیا۔ اس زمانے میں حیاتِ جاوید کے شائع کرانے میں مولانا بہت زیر بار ہو چکے

تھے۔ اب آنکھ کے آپریشن میں ساڑھے تین سو روپے اور خرچ ہو گئے اور اس کی وجہ سے ان کی مالی مشکلات بڑھ گئیں۔ آپریشن سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ معمولی طور پر لکھنے پڑھنے لگے مگر آنکھ پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی۔ کچھ عرصے بعد دوسری آنکھ میں پانی اُتر آیا اور مئی ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ جا کر دوسری آنکھ کا آپریشن کرانا پڑا اور اس کے بعد عینک کی مدد سے کام چلتا رہا۔

دسمبر ۱۹۰۷ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا اور مولانا حالی کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ وہ اس قدر منکسر مزاج تھے کہ واقعتاً اپنی عظمت سے بالکل واقف نہ تھے۔ اس موقع پر بڑی سادگی سے خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں "لوکل کمیٹی کراچی اور سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی علی گڈھ نے غلطی سے اجلاس کراچی میں مجھے پریسیڈنٹ بنانا تجویز کیا ہے۔ ہر چند عذرات کئے گئے مگر مجھے اس قدر مجبور کیا کہ انکار کرنے کا محل باقی نہ رہا......" چنانچہ ۲۱ دسمبر ۱۹۰۷ء کو مولانا حالی نے ۷۰ برس کی عمر میں کراچی کا طول طویل سفر کیا۔ ان کے ساتھ خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام السبطین، نواب وقار الملک۔ میجر سید حسن وغیرہ کل تقریباً سولہ سترہ آدمی اور تھے۔ ۲۳ کو رات کے وقت کراچی پہنچے۔ کانفرنس میں مولانا حالی نے جو خطبہ صدارت پڑھا وہ بڑا پُر خلوص اور اثر آفریں تھا۔ اس میں انہوں نے قوم کو ہر قسم کے علوم و فنون حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ اور سودیشی کی تحریک کی اہمیت بھی بتائی تھی۔

"بہر حال مسلمانوں کی قومی ترقی کے لئے محض یونیورسٹی کی موجودہ تعلیم کافی نہیں بلکہ ضرور ہے کہ تعلیم کے ہر شعبے میں دستگاہ حاصل کریں اور اس دوڑ میں جس میں ان کے ہم وطن ان سے بہت آگے نکل گئے ہیں جہاں تک ممکن ہو شریک ہوں۔ ورنہ وہ زمانہ بہت قریب ہے کہ ان کو نہ صرف اپنی عزت و توقیر سے بلکہ اپنی بقا اور اپنی ہستی

سے بھی ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس کے بعد کہا :-

"صاحبو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صنعت وحرفت کی ضرورت ہندوستان میں عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے ۔ جب سے سودیشی کی تحریک شروع ہوئی ہے ہمارے ہم وطن اُس کی طرف اور بھی جلد جلد قدم بڑھا رہے ہیں ۔ گورنمنٹ نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ اس ملک کی مالی مشکلات جس میں وہ اکثر مبتلا رہتا ہے اُن سے اس کا نجات پانا محض صنعت وحرفت کی ترقی پر منحصر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگرچہ مسلمان بھی اس کی ضرورت سے انکار نہیں کرتے لیکن عملی طور پر وہ اب تک اس سے بالکل الگ رہے ہیں اور نہایت اندیشہ ہے کہ جس طرح وہ ابتدا میں انگریزی تعلیم سے نفرت کرنے کے سبب اپنی تمام ہم وطن قوموں سے پیچھے رہ گئے اور اب کسی طرح ان کی برابری نہیں کر سکتے اسی طرح صنعت وحرفت سے بھی اس وقت ان کی غفلت کا انجام وہی نہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

کتنی صحیح پیش گوئی تھی ! حالی کا اندیشہ ٹھیک نکلا اور ان کے ہم قوموں کی اکثریت نے نہ صنعت وحرفت کی طرف توجہ دی، نہ سودیشی تحریک کو پوری طرح اپنایا ۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ ملک میں اقتصادی لحاظ سے بہت پس ماندہ اور مجبور ہیں ۔

اس زمانے میں مولانا حالی نے ایک **آل نامہ** لکھنا شروع کیا تھا جو مزاح کا ایک عجیب وغریب اور دلچسپ نمونہ تھا ۔ افسوس کہ یہ پورا نہ ہو سکا ۔ اس میں ہر مذہب اور فرقے کے تعصب، تنگ نظری، حماقت، جہالت، خود غرضی وغیرہ پر چوٹ کی گئی ہے ۔ اس میں سے چند لفظ نمونے کے طور پر دیکھئے ۔

لفظ	معنی
المذہب	**اعلانِ جنگ**
الدین	**تقلید آبا واجداد**

العلم	قسمے از جہلِ مرکب
الامتحان	آزمائش لیاقتِ ممتحناں
الیونیورسٹی	کارخانہ کلرک سازی
المسلمانانِ ہند	چوں مارگزیدہ از ریسماں ترسندگان
الرئیس	آں کہ از ریاست بے خبر باشد
الامیر	آں کہ تہیدت و قرضدار باشد
المولوی	آں کہ مسلماناں را از دائرہ اسلام خارج می کردہ باشد۔
الواعظ	آں کہ در تفریق بین المسلمین خطا نہ کند
الشکار	بہانہ آدم کشی

افسوس ہے کہ یہ مکمل نہ ہوسکا ورنہ اپنے طرز کی لاجواب طنزیہ چیز ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عمر میں بھی حالی کی ذہنی جودت اور دقتِ نظر پوری طرح کار فرما تھی۔

مولانا حالی کی بڑی خواہش تھی کہ کم سے کم انہیں زندگی کے اس آخری زمانے میں سکون و اطمینان میسر آجائے تاکہ جو کام ان کے ذہن میں ہیں انہیں انجام دے سکیں۔ وہ اپنا عربی و فارسی کلام مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اردو زبان کی تذکیر و تانیث کے اصول مرتب کرکے اس کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا ان کا خیال تھا۔ اس کے علاوہ ان کی خواہش تھی کہ اردو میں اعلےٰ درجے کے ڈرامے اور ناول لکھے جائیں اور دوسری زبانوں کے بلند پایہ ناول اور ڈرامے ترجمہ کئے جائیں جو اردو میں نمونہ کا کام دے سکیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود ان کا جی چاہتا ہے کہ کوئی ڈراما لکھیں۔ غرض بہت سے مفید کام اُن کے ذہن میں موجود تھے۔ لیکن بڑھاپا، بیماری، کمزوری اور خانگی تفکرات اس کا موقع نہیں لینے دیتے تھے کہ اطمینان

سے کام کر سکیں۔

غالباً ۱۹۱۱ء میں مولوی عبدالحق صاحب نے انہیں اورنگ آباد بہت اصرار سے بلایا کہ یہاں کا موسم خوشگوار ہے' آب و ہوا معتدل ہے' پانی لطیف ہے اور یہ بہت پُر فضا مقام ہے۔ آپ یہاں آیئے۔ آپ کی صحت کو بھی فائدہ ہو گا۔ اور اطمینان سے کام کرنے کا موقع بھی ملے گا۔ مولانا حالی کا خود جی وہاں جانے کو چاہتا تھا اور وہ تیار بھی ہو گئے لیکن اس ضعیفی اور کمزوری کی حالت اعزا کسی طرح اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ وہ اتنا دوردراز کا سفر کریں۔ مولوی صاحب کو کس انداز سے لکھتے ہیں۔

"الحمدُ للّٰہ آپ اورنگ آباد میں خوش ہیں۔ اللہ تعالےٰ ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ میرا بھی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ چند روز وہاں آکر رہوں مگر پیرانہ سالی میں اس قدر دور دراز کی مسافت پر کسی دوست کے پاس جاکر رہنا یا تو اس کو بیمارداری کی تکلیف دینی ہے یا اُس پر تجہیز و تکفین کا بار ڈالنا ہے۔....."

کچھ عرصے بعد مولوی عبدالحق نے اپنے آنے کے متعلق لکھا۔ اس پر حالی کس لطیف پیرائے میں اپنی زندگی سے مایوسی کا ذکر کرتے ہیں

"آپ نے بہت جلد تشریف لانے کا وعدہ کیا ہے۔ مگر میں اپنی حالت کے لحاظ سے کسی کا یہ شعر پڑھتا ہوں ؎

خدا ہی جانے سحر ہو' نہ ہو' جیئں نہ جیئں
شبِ فراق کئی احتمال رکھتی ہے

میں اپنی طرف سے تو اس وقت تک زندہ رہنے کے لئے بہت کوشش کروں گا۔"

لیکن اس اندازِ بیان ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کسی خوش مذاق ادیب اور شاعر کا خط ہے۔ کسی زندگی سے مایوس' بیمار بوڑھے کا نہیں۔

اس سکون کی تلاش میں ایک مرتبہ کچھ عرصے کے لئے وہ فرید آباد میں اپنے

ہم وطن ڈاکٹر لیاقت حسین صاحب کے ہاں جاکر بھی رہے تھے۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء سے دسمبر ۱۹۱۳ء تک، جب انہوں نے اپنے عربی فارسی کلام کو مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ جو ان کے انتقال کے بعد چھپ کر آیا۔ مگر فرید آباد میں بھی اطمینان سے کام کرنے کا موقع نہ ملا۔ وہاں بھی لوگ دن رات ملنے آیا کرتے تھے اور ان کا بیشتر وقت ان لوگوں کی نذر ہو جاتا تھا۔

انتقال کے کچھ مہینے پہلے مولانا حالی کے دماغ کے اعصاب پر کچھ ایسا اثر ہو گیا تھا کہ وہ بات نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی بات کرتا تو سمجھ جاتے، چہرہ پر ہلکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ادراک کی چمک نظر آتی لیکن جب تک جواب دماغ سے زبان تک آئے اعصاب جواب دے دیتے اور مسکراہٹ بے بسی میں بدل جاتی۔

مگر اس میں دماغ کا بھی کیا قصور تھا؟ چار سال کی عمر سے اسی سال تک تقریباً چھتر سال جو دماغ دن رات کام کرتا رہا ہو، جس نے ساری عمر طلب علم میں بسر کی ہو اور ساٹھ سال تک ٹھوس علمی کام کرتا رہا ہو، جس نے ستر سال تک ہر قسم کی فکریں، پریشانیاں، رنج و مصائب خاموشی سے جھیلے ہوں، اُس کا اتنے عرصے تک کام کرتے رہنا حیرت کی بات ہے نہ کہ چند مہینے کے لئے بیکار ہو جانا۔ میری والدہ مشتاق فاطمہ سنایا کرتی تھیں کہ ایک دفعہ بچپن میں ہم نے یہ سُنا کہ انگریز مولانا حالی کا دماغ خرید لیں گے اور ان کے انتقال کے بعد اُس کا آپریشن کر کے دیکھیں گے کہ اس میں کیا خاص بات ہے جس کی وجہ سے انہوں نے ایسے بڑے بڑے کام انجام دیئے (اسی قسم کی باتیں سرسید کے دماغ کے بارے میں بھی مشہور تھیں) اماں فرمایا کرتی تھیں کہ ہم یہ سُن کر بہت روئے تو "دادا باجی" نے ہنس کر ہمیں سمجھایا اور کہا ایسا ہوتا بھی تو یہ رونے کی نہیں خوش ہونے کی بات تھی۔

ظاہر ہے کہ یہ لوگوں کے اپنے جذبات اور خیالات تھے۔ اور وہ حیرت جو

انہیں حالیؔ اور سرسید جیسے دماغوں کو دیکھ کر ہوتی تھی اُسے انگریزوں کی طرف منسوب کر کے ظاہر کرتے تھے۔

آخر ۳۱؍ دسمبر ۱۹۱۴ء کو علم و ادب کا یہ گوہرِ گراں مایہ، جس نے اردو میں جدید شاعری کی بنا ڈالی اور تنقید میں امامت کا مقام حاصل کیا، جس نے اپنی مسدس میں ایک قوم کے عروج و زوال کی داستان کو امر بنا دیا، جس کا دماغ بلند اور دل دَرد مند تھا، اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا اور اُس کی جان نے جانِ آفریں کے پاس پہنچ مقامِ محمود حاصل کیا۔

پانی پت میں درگاہِ قلندر صاحب کے صحن میں مسجد کے حوض کے کنارے، سنگِ مرمر کی ایک خوبصورت قبر میں حالیؔ آسودہ خواب ہیں۔ یہ مقام ہمیشہ شعر و ادب کے قدر دانوں کے لئے آستانۂ نیاز بنا رہے گا۔

آب و رنگ

بچپن ہی سے حالی میں وہ ذہنی بیداری نظر آتی تھی جسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ یہ بچّہ دنیا میں کچھ ہو کر رہے گا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا" چار سال کی عمر میں جب انہیں پڑھنے بٹھایا گیا اور اس زمانے کے دستور کے مطابق سب سے پہلے قرآن شریف شروع کرایا گیا تو انہوں نے تھوڑے ہی دن میں پورا کلام مجید حفظ کر ڈالا اور تعلیم کی اس منزل کو اور بچوں سے بہت پہلے طے کر لیا۔ اس کے بعد ایک مدّت تک انہیں باقاعدہ تعلیم نہیں مل سکی۔ مگر انہوں نے اپنے شوق کو نہیں چھوڑا۔ اور کوئی ہوتا تو چھوٹی سی عمر میں شادی ہو جانے سے اس کی تعلیم بالکل رک جاتی مگر حالی ان رکاوٹوں کو کب مانتے تھے۔ انہوں نے گھر بار چھوڑا، وطن چھوڑا، چھپ کر دلّی چلے آئے اور یہاں طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا کر علم کی پیاس بجھاتے رہے۔ بیچ بیچ میں کئی مرتبہ پڑھنے کا سلسلہ چھوڑنا پڑا۔ مگر دراصل یہ سلسلہ کبھی ٹوٹنے نہیں پایا۔ جب کوئی پڑھانے والا نہ ملتا تو لُغت کی مدد سے خود ہی پڑھ لیا کرتے۔ اس سچّی علمی لگن کا یہ نتیجہ ہوا کہ باقاعدہ تعلیم نہ پاسکنے کے باوجود وہ عربی، فارسی، اردو ادب کے ماہر اور قرآنِ پاک اور تفسیر کے عالم بن گئے۔ فقہ، حدیث، منطق وغیرہ سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لی اور شاعری اور انشا پردازی کے میدان میں تو وہ جوہر دکھائے کہ ان کے نام کو بقائے دوام حاصل ہو گئی۔ گو وہ انگریزی زبان اور مغربی علوم کی درسی تعلیم سے محروم رہے مگر

اپنی لاہور کی چند سالہ ملازمت میں جب وہ مغربی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے درست کیا کرتے تھے، وہ کچھ حاصل کر لیا جو دوسرے لوگ اکثر اپنی آدھی عمر اسکول اور کالج میں صرف کرنے کے بعد بھی نہیں سیکھ سکتے۔ چار سال کی عمر میں حالی نے طلب علم کی راہ میں قدم رکھا تھا اور اسّی سال کی عمر تک وہ پورے شوق اور لگن کے ساتھ اس راہ پر گام زن رہے۔ جس سے جب اور جہاں انہیں فیض حاصل کرنے کا موقع ملا انہوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا۔ ایک سچے طالب علم کی یہی شان ہے۔

لیکن علم حاصل کرنے کے لئے سچے شوق کے علاوہ ایک اور شرط بھی لازمی ہے۔ یعنی محنتی ہونا خوش قسمتی سے یہ صفت بھی حالی میں موجود تھی۔ اول دن سے آخری دم تک حالی ایک مزدور کی طرح کام میں لگے رہے۔ ملازمت کے فرائض کے علاوہ مطالعہ، تصنیف و تالیف اور بہت سے متفرق کاموں کو جو انہوں نے اپنے ذمے لے رکھے تھے صحت اور بیماری، طاقت اور کمزوری ہر حالت میں بڑی پابندی اور محنت سے انجام دیتے تھے۔ کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ ہوتا تو پہلے اُس کی پوری تیاری کرتے۔ اُس کے لئے مسالہ فراہم کرنے میں اپنی جان لڑا دیتے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "عربی کا ایک قول ہے کہ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کام کتنے دنوں میں ہوا، البتہ یہ سب دیکھتے ہیں کہ کیسا ہوا۔" ان کا اصول تھا کہ جو کام کیا جائے پوری توجہ اور محنت کے ساتھ کیا جائے۔ بڑھاپے اور کمزوری کے زمانے میں انہوں نے دو مرتبہ علی گڑھ کالج کے لئے حیدر آباد کا، ایک مرتبہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کے لئے کراچی کا سفر کیا اور اس کے علاوہ دِلّی، علی گڑھ لکھنؤ، پٹیالہ، لاہور اور دوسرے قریب کے شہروں کے تو بے شمار سفر کئے۔ ان کی یہ محنت صرف قومی کام، مطالعے اور تصنیف و تالیف ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ اپنے بھی فرائض کو جو خدا نے یا سماج نے ان پر عائد کئے تھے بڑی مستعدی اور تن دہی سے انجام دیتے تھے۔ اس علم کے سچے شیدائی کو، جس کی دلی خواہش یہ تھی کہ اپنی

زندگی کا ایک ایک لمحہ تحصیلِ علم میں صرف کر دے، اپنے فرائض کا اتنا گہرا احساس تھا کہ اُس نے اپنے خاندان کی کفالت کی خاطر عمرِ عزیز کے تقریباً تیس سال مختلف جگہ کی ملازمتوں میں گزارے. جو کام بھی سپرد ہوا خواہ وہ کسی دفتر کی کلرکی ہو یا کسی رئیس کے بچوں کی اتالیقی، ترجموں کی اصلاح ہو یا اسکول کی مدرسی اُسے پوری توجہ، محنت اور دیانت کے ساتھ انجام دیا.

مولانا حالؔی کا خاندان بہت بڑا تھا اور دل اُس سے بھی بڑا. ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے اور محتاج کی مدد کے لئے وہ ہر وقت حاضر رہتے تھے. آمدنی بہت کم تھی مگر قناعت کی انمول دولت سے مالا مال تھے. کسی قسم کا لالچ انہیں چھو کر بھی نہیں گیا تھا. انہوں نے کبھی اپنے دوستوں کے ذریعے سے کسی بڑی ملازمت کی کوشش نہیں کی. اگر مولانا حالؔی چاہتے تو حیدر آباد میں انہیں کوئی بڑی جگہ مل سکتی تھی. علی گڑھ کالج میں بڑی آسانی سے پروفیسر ہو سکتے تھے مگر انہوں نے کبھی اس کی بھی خواہش نہیں کی. وہ سمجھتے تھے کہ باہر رہ کر وہ علی گڑھ کی جتنی خدمت کر سکتے ہیں ملازم ہونے کے بعد اس آزادی سے نہیں کر سکیں گے. اور جب حیدر آباد سے ساٹھ روپے ماہوار (پچھتر حالی) کا وظیفہ مقرر ہوا تو انہوں نے اینگلو عربک اسکول کی ملازمت سے استعفا دیدیا. اسی قلیل آمدنی پر قناعت کر کے علمی، ادبی کاموں میں مصروف ہو گئے. حیدر آباد کا وظیفہ تصنیف و تالیف کے شعبے سے دیا گیا تھا. حالؔی کی دیانت داری کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ اس مد سے وظیفہ لیں اور اپنا وقت دوسری ملازمت میں بھی صرف کریں.

لیکن ان کے استغنا اور قناعت کی ایک مثال ایسی ہے جس کی نظیر ادب کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی. انہوں نے اپنی تصانیف سے کبھی مالی فائدہ نہیں اٹھایا. ایک آدھ کتاب کے سوا باقی مشہور تصانیف کی رجسٹری نہیں کرائی اور نہ حقِ تصنیف لیا. سب تصانیف قوم کے لئے وقف رہیں. بیسیوں ناشروں نے ان کی کتابوں سے

ہزاروں لاکھوں روپے کمائے اور کما رہے ہیں لیکن خود مصنّف نے اُن سے ایک پیسہ کا فائدہ نہ اٹھایا۔ اُن کا اصول تھا جو کتاب قوم کی اصلاح کی غرض سے لکھی جائے اُسے کسی کی ملکیت نہیں ہونا چاہیئے ورنہ وہ قوم کو خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر حالیؔ صرف مسدّس ہی کی رجسٹری کرا لیتے تو نہ صرف وہ خود بلکہ ان کی اولاد بھی ایک مدّت تک کے لئے کسبِ معاش سے بے فکر ہو جاتی۔ مگر حالیؔ نے اپنی کتابوں کو قوم کے لئے وقف کر کے سچّی قناعت کی ایک ایسی مثال چھوڑی جو اب دیکھنے میں نہیں آتی۔

قناعت اگرچہ بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے پھر بھی یہ کوئی نایاب جوہر نہیں۔ سچا آرٹسٹ اکثر اس دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ اُسے روپے کی ہوس نہیں ہوتی لیکن اسی کے ساتھ اُسے شہرت اور عزّت کی خواہش بہت شدّت کے ساتھ ہوتی ہے خصوصاً شاعر تو اس معاملے میں بہت بدنام ہیں۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ حالیؔ شہرت اور نام نمود کی طلب سے بھی مستغنی تھے یہی نہیں بلکہ وہ شہرت سے گھبراتے تھے اور گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر خاموش خدمت کرنا انہیں پسند تھا۔ حالیؔ اس اٹل حقیقت کو پا گئے تھے کہ جسے شہرت ونمود کی چاٹ لگ جائے وہ قوم کی ٹھوس اور سچّی خدمت نہیں کر سکتا۔ اور قومی خدمت میں خود غرضی کا کھوٹ شامل ہوا تو اُس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ جب رہبرِ قوم (یا خادمِ قوم) کو قوم کی خدمت سے زیادہ اس کی فکر رہے گی کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے اس کی شہرت کو داغ لگ جائے، اُس کی ہردلعزیزی میں کمی آ جائے، اُس کی دنیاوی اور ظاہری عزّت کو بٹّہ لگ جائے، وہ ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم رکھے گا اور مصلحت کو حق پر ترجیح دے گا۔

اور حالیؔ نے تو اپنے لئے کام ہی وہ چُنے تھے جن کا انعام بدنامی اور مخالفت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ انھوں نے قدامت پسندی، روایت پرستی، نفرت، تعصب

جہالت اور بے عملی کے بتوں کو توڑنے کا عزم کیا تھا۔ وہ شعر و ادب کے پرانے اور نکمّے سانچے توڑ کر نئے سانچے گھڑنا چاہتے تھے۔ ایسا ادب پیدا کرنا چاہتے تھے جو نئے زمانے کے ساتھ ساتھ چل سکے۔ انہیں قوم کو غفلت کی گہری نیند سے جگانا اور سچّی اور کڑوی باتیں سنانے کا صبر آزما اور کٹھن کام انجام دینا اور ساری دنیا سے بیر مول لینا تھا۔

کہدو جنہیں اصلاح کا ہے قوم کی چاؤ طعنے جھیلو، بُرا سنو، گالیاں کھاؤ
یہ قوم کی خدمت کا صلہ ہے سرِ دست گر اس پہ قناعت کا ارادہ ہے تو آؤ

حالؔی نے یہ صلہ خوب خوب پایا مگر قومی خدمت سے منہ نہ موڑا۔

بہ قول مولانا محمد علی مرحوم " اگر حیاتِ جاوید اور مسدس حالی کا مصنّف شہرت پسند ہوتا اور کسبِ شہرت کرتا تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُس کا نام دنیاوی اور مادّی نقطۂ خیال سے بہت بلند ہوتا۔ لیکن اُس نے کبھی بازار میں بِکنا گوارا نہ کیا۔ اور مولانا حالؔی کا یہ امتیازی کیرکٹر تھا جو ہماری قوم میں بہت ہی کم نظر آتا ہے "۔

حالؔی " بازار میں نہیں بِکے " انہوں نے چپ چپاتے زندگی بھر ٹھوس علمی اور ادبی کام کئے۔ چالیس سال تک انہوں نے خاموشی سے علی گڑھ کالج کی خدمت کی۔ نہ وہ خطاب کے خواہاں تھے نہ صدارتوں کے آرزومند۔ انتہا یہ ہے کہ انہیں اپنے ادبی کارناموں کی تعریف کی بھی طلب نہ تھی۔

مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے اخبار افسر میں حالؔی کی نثر کی تعریف کی۔ اُسے پڑھ کر ان کو خط میں لکھتے ہیں۔ "میں آپ کے ریمارکس کا جو آپ نے میری نثر کی نسبت کئے ہیں دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر یہ سچ ہے کہ ہماری اور ہمارے ہم عصروں کی نظم و نثر پر صحیح رائیں اُس وقت تک جب تک کہ ہم اور ہمارے طرفدار یا ہمارے مخالف دنیا میں موجود ہیں قائم نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ خود ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اُس کے

اسٹائل میں کون سی ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ اُس کو اوروں کے طرز پر ترجیح دے سکتا ہے۔"

حیاتِ جاوید پر مولوی عبدالحق نے ریویو کیا اس پر انہیں لکھتے ہیں "حیاتِ جاوید پر آپ کا ریویو دیکھا۔ جو کلمات بتقاضائے محبّت تصنیف اور مصنّف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں اگرچہ میں اپنے تئیں ان کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن بہرحال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔ یہ وہی خصلت ہے جس کو اہلِ ایران یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، اور ہماری زبان میں چھڑک چھڑک کر بیچنا کہتے ہیں۔"

آج کل کے زمانے کے ادیبوں اور مصنّفوں کو جن میں سے اکثر "یار فروشی" اور "چھڑک چھڑک کر بیچنے" میں اپنا جواب نہیں رکھتے حالی کی اس گراں قدر رائے پر غور کرنا چاہیئے کہ جب تک ہم اور ہمارے ذاتی دوست اور مخالف دنیا میں موجود ہیں اُس وقت تک ہماری نظم اور نثر پر بالکل صحیح اور بے لاگ رائیں نہیں دی جاسکتیں۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر شاعر اور ادیب اور قومی رہنما جو اپنے زمانے میں ملک میں اس سِرے سے اُس سِرے تک مشہور تھے اب اُن کی شہرت کچھ مدھم سی پڑ گئی ہے، دنیا انہیں بھولتی جا رہی ہے لیکن نام و نمود سے بھاگنے والے، شہرت و عزّت سے مستغنی حالی کا نام اب تک اُسی طرح مشہور ہے۔ اُس تنہائی پسند خاموش انسان کا ڈنکا اب تک بج رہا ہے۔ کیا درحقیقت جو لوگ شہرت و عزّت کے پیچھے بھاگتے ہیں وہ ان سے دور ہٹتی ہے اور جو اُس کی پرواہ نہیں کرتے اُنہیں کو نصیب ہوتی ہے؟

مولانا حالی کی طبیعت میں متانت اور سنجیدگی بہت تھی۔ یہاں تک کہ وہ کبھی بلند آواز سے گفتگو بھی نہیں کرتے تھے بلکہ دھیمی اور شیریں آواز میں ٹھیر ٹھیر کر آہستگی سے دل نشیں انداز میں باتیں کیا کرتے۔ کبھی قہقہہ مار کر یا زور سے نہیں ہنستے تھے۔ اس کے بجائے ہلکی سی دلکش مسکراہٹ اُن کے چہرے کو تابناک بنائے رکھتی۔ کوئی بات کتنی ہی ناگوار

گذر ہے چیخ کر یا غصّے سے اس کا جواب نہیں دیتے تھے۔ اور نہ کبھی کوئی بُرا لفظ اپنے منہ سے نکالتے تھے۔ ایک مرتبہ لاہور میں ایک بڑے عالم فاضل بزرگ جو کسی عربی اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے اُن سے ملنے آئے اور بڑی دیر تک اُن سے کسی بات پر بحث کرتے رہے۔ عالم صاحب اُس وقت شراب پیئے ہوئے تھے۔ منہ سے شراب کے بھپکے آرہے تھے۔ اور باتوں میں بھی نشے کا اثر اور جوش تھا۔ مولانا حالؔی کو اُن کی یہ حالت اور گفتگو بہت ناگوار ہوئی۔ دیر تک تو صبر سے برداشت کیا کئے آخر عاجز آکر اُن کے منہ سے نکل گیا۔ "مولانا آپ ایسی حالت میں یہاں نہ آیا کیجئے"۔ کہنے کو تو یہ جملہ کہہ دیا مگر حالؔی کے نزدیک یہ بھی بہت سخت فقرہ تھا۔ بہت پشیمان ہوئے اور جب وہ رخصت ہوئے تو دور تک اُن کے ساتھ گئے اور غالباً اُن سے بہت معذرت کی۔ مولانا ابو الکلام کا قول ہے کہ "مولانا حالؔی سنجیدگی کی مجسّم تصویر تھے"۔

اُن کی طبیعت میں حیا کا مادّہ بھی بہت تھا۔ خصوصاً اپنی تعریف سن کر بہت شرماتے تھے۔ مولانا آزاد نے ایک مشاعرہ کا واقعہ سنایا جس میں مولانا حالؔی کی غزل بہت پسند کی گئی اور داغؔ تک نے ان کی غزل کی بڑی تعریف کی۔ مولانا آزاد نے کسی شخص سے یہ واقعہ سُنا جب کچھ دن بعد مولانا حالؔی سے ملنے گئے تو اس مشاعرے کا ذکر بھی آیا۔ انہوں نے کئی مرتبہ اس مشاعرے کا ذکر چھیڑا اور چاہا کہ مولانا کے منہ سے داغؔ کی تعریف کے الفاظ سُنیں لیکن مولانا حالؔی ہر مرتبہ "جی ہاں ــــ کیا کہا جائے...." کہہ کر اس بات کو ٹال گئے اور کوئی دوسرا ذکر چھیڑ دیا اور ہرگز اپنی زبان سے وہ تعریفی جملہ ادا نہ کیا جو مولانا آزاد اُن سے سننا چاہتے تھے۔

شاعروں کو اپنا کلام سُنانے کا جو شوق ہوتا ہے وہ کون نہیں جانتا؟ لیکن حالؔی اس سے ہمیشہ کتراتے تھے۔ جب کوئی فرمائش کرتا تو اُسے اکثر ٹال جاتے۔ اگر بہت زیادہ اصرار ہوتا تو مجبوراً چند شعر سُنا دیتے تھے۔ مولانا عبدالحق صاحب ایک دفعہ کا

واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حیدرآباد میں سرسیّد کی برسی کا جلسہ تھا جس میں مولانا حاؔلی نے سرسیّد پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ مضمون کافی لمبا تھا اور ضعیفی کا زمانہ۔ پڑھتے پڑھتے گلا خشک ہو گیا، حلق میں کانٹے پڑ گئے لیکن پانی نہیں مانگا۔ جب بعد میں اس کا ذکر آیا اور مولوی صاحب نے اُن سے کہا کہ وہاں پانی شربت سب کچھ موجود تھا آپ نے کہا ہوتا تو فوراً حاضر کیا جاتا۔ کہا ”اتنے بڑے مجمع میں پانی مانگتے ہوئے شرم معلوم ہوئی۔“

غیبت اور بدگوئی سے انہیں دلی نفرت تھی۔ ان کے دیکھنے والوں اور ساری عمر ساتھ بسر کرنے والوں کا بیان ہے کہ ہم نے کبھی ایک لفظ کسی کی برائی کا حاؔلی کے منہ سے نہیں سُنا۔ وہ عام طور پر لوگوں کی طرف سے نیک خیال اور حسنِ ظن سے کام لیتے تھے۔ غیبت، بدگوئی، بدگمانی ان کے نزدیک بہت بڑے گناہ تھے۔ ان کے اکثر اس قسم کے شعر، یا قطعے یا رباعیاں ہیں جس میں انہوں نے ان عیبوں کی بُرائی کی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں — بدگوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی برائی ہی پہ ہے فخر وہاں — خوبی کوئی باقی نہیں جس امت میں

خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے ”مولانا یونانی خیالات کی رُو سے ایک معتدل ومتوسط کامل انسان اور صوفیانہ خیالات کی رُو سے ایک صاحبِ باطن ولی تھے۔ کبھی کسی کی برائی ان کے منہ سے نہیں سُنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے۔۔۔۔“

سیّد ہاشمی فرید آبادی نے لکھا ہے کہ ”مجھے یہ سبق پہلی مرتبہ ان کی صحبت میں حاصل ہوا کہ اتنے وسیع تعلقات اور واقفیت کے باوجود آدمی اگر چاہے تو اپنی ہمہ رنگ اور ہمہ گیر گفتگو کو لوگوں کی ہجوِ بےجا اور مذلتِ ذات سے خالی رکھ سکتا ہے۔“

ہمارے دیس میں عام طور پر اہلِ علم اور فن کار لاپروا، بے سلیقہ اور دنیا کے واقعات اور حالات سے بیگانہ محض ہوتے ہیں اور یہ ان کی خاص صفات سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن حالی باوجود عالم، شاعر اور ادیب ہونے کے ان "صفات" سے آراستہ نہ تھے۔ وہ منتظم، سلیقہ شعار، صفائی پسند اور خوش ذوق انسان تھے۔ ان کے لباس میں، مکان میں، طرزِ رہائش اور معاشرت ہر چیز میں سادگی اور نفاست، سلیقہ اور صفائی کا خوبصورت امتزاج نظر آتا تھا۔

مولانا حالی عام طور پر کرتا، پاجامہ، اچکن پہنتے تھے اور صافہ باندھتے تھے۔ جاڑے میں اچکن پر چوغہ یا روئی کا دگلہ ہوتا تھا اور گلے میں مفلر لپیٹ لیتے تھے۔ کبھی کبھی ایک گول سی ٹوپی بھی پہنا کرتے تھے۔ لباس کی صفائی ستھرائی اور موزونیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ خواجہ سجاد حسین کا فرمانا ہے "جوانی میں باریک اور نفیس کپڑا پہنتے اور پسند کرتے تھے۔ لیکن چونکہ سودیشی کے بڑے حامی تھے اس لئے اگر پانی پت کی بنی ہوئی 'چوتار' (باریک کھدر) کا تھان مل جاتا تو اُس کے کپڑے بنا کر بہت خوش ہوتے تھے۔"

کپڑا خریدتے تو بہت دیکھ بھال کر، کہ رنگ، ڈیزائن اور قسم سب موزوں ہو۔ جب حیدر آباد گئے تھے تو وہاں سے بہت سے اطلس کے تھان لائے جو رنگ، وضع اور پائیداری میں لاجواب تھے۔ میں نے خاندان کی اکثر بڑی بوڑھیوں کے پاس اُن خوبصورت تھانوں کے پاجامے دیکھے ہیں۔

خواجہ سجاد حسین کو ایک روئی کی مرزئی کے لئے لکھتے ہیں "اگر روئی کی ایک "فتوحی" جس میں زیادہ روئی ہو بنواتے لاؤ تو مجھے بہت آرام ملے۔ بٹن چھوٹے نہ ہوں بڑے بڑے ہوں اور فتوحی زیادہ ڈھیلی نہ ہو، ابرہ کلپ دار چھینٹ کا نہ ہو اور استر نقلی فلالین کا ہو تو بہتر ہے یا اور کوئی نرم کپڑا ہو۔"

فرید آباد سے لڑکیوں کے لئے مہندی بھیجی تو ساتھ یہ ہدایت بھی تھی کہ "زیادہ

دیر نہ لگائیں کیونکہ اس کا رنگ بہت تیز ہوتا ہے۔ اور دیر تک لگی رہے گی تو ہاتھ پاؤں میں بجائے سرخی کے سیاہی آجائے گی۔"

چائے ناشتے کا سب سامان ہمیشہ قرینے اور قاعدے سے ایک جگہ رکھا رہتا تھا۔ ملازموں کو اچھی چائے بنانے کی ترکیب سکھا دی گئی تھی۔ اور دن میں کئی مرتبہ چائے بنتی تھی۔ حقہ بھی اہتمام کے ساتھ بھرا جاتا تھا۔۔۔۔ ضرورت ہو تو خود اپنے ہاتھ سے بھی بھر لیتے تھے۔ کہیں جاتے تو اُن کی ضرورت کی سب چیزیں ان کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔

اپنے نشست کے کمرے میں اُٹھنے بیٹھنے کی جگہ، پلنگ، لکھنے کی میز اور کمرے کے دوسرے سامان کی ترتیب اکثر بدلتے رہتے تھے جس کی وجہ صرف موسم کا تغیر ہی نہیں بلکہ جدّت پسندی بھی تھی۔

مکان کی تعمیر، آرائش، سجاوٹ، گھر کے دوسرے کاموں میں مشورہ اور رائے دینا، دواؤں کا انتخاب اور اُن کو بنانے اور استعمال کرنے کی ترکیب، چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر قسم کے کاموں کا ان کو سلیقہ اور مشق تھی۔

موسمی پھل اور ترکاریاں بہت مرغوب تھیں۔ خاص طور آم اور خربوزے۔ اور ان دونوں پھلوں کی غضب کی پہچان تھی۔ خواجہ سجاد حسین سے ایک مرتبہ کہا "قاضی کے حوض پر فلاں سمت ایک آم والا بیٹھتا ہے اُس سے اتنے آم لے آؤ۔ آم زرد رنگ کے ہیں۔ اور ہر آم کے منہ کے پاس ایک سرخ رنگ کا ناخون کا سا نشان تم دیکھو گے۔ اچھی طرح چھانٹ کر ایسے ہی آم لانا۔"

حالی اپنے آس پاس کی چیزوں کو آنکھ کھول کر غور سے دیکھتے تھے۔ ان کا مشاہدہ باریک اور گہرا تھا۔ خواجہ سجاد حسین کا بیان ہے کہ "والد مرحوم جو مشاہدہ کرتے تھے۔ اُس کا اُن کے دل پر گہرا اثر ہوتا تھا۔ دو تین مرتبہ دہلی میں جامع مسجد، چاوڑی بازار سے گزرتے ہوئے انہوں نے کہا پہلے ہر دس بیس آدمیوں میں سے ایک دو آدمی

جسمانی لحاظ سے دیکھنے کے قابل گزرتا تھا اور اب وہی دلّی ہے کہ سینکڑوں میں ایک آدمی بھی رو دار نظر نہیں آتا.....“

باوجود اچھی چیزوں کے شوق اور نفاست پسندی کے طرز زندگی سادہ تھا اور خرچ کم کرتے تھے۔ کفایت اور انتظام کو ہر بات میں ملحوظ رکھتے۔ ان کی طبیعت میں اعتدال اور توازن کا جو مادہ تھا اُس کی بدولت قلیل آمدنی میں نہ صرف خود سلیقے اور آرام سے رہتے تھے بلکہ اُسی میں لین دین، تحفے تحائف، ضرورت مندوں کی مدد، حاجت مندوں کی حاجت روائی بھی کرتے تھے۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم لکھتے ہیں کہ مولانا حالی کے ”اخلاق میں، عادات میں، برتاؤ میں، مروّت میں، فیاضی میں اعلیٰ درجہ کا اعتدال تھا۔“

حالی حُسنِ اخلاق کا ایک پیکر تھے۔ خوش مزاجی، شیریں زبانی اور مروّت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جو بھی دو ایک مرتبہ اُن سے مل لیتا ہمیشہ کے لئے اُن کا گرویدہ ہو جاتا۔ ان کے بڑے بڑے مخالفین جو اُن کی نظم و نثر پر جا بے جا اعتراض جڑا کرتے اگر ایک بار بھی اُن کی صحبت کا لطف اٹھا لیتے تھے تو اُن کے ڈنک گر جاتے تھے اور پھر حالی کو بُرا کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ملنے جلنے والوں، دوستوں اور اہلِ غرض کا ہمیشہ ان کے پاس تانتا بندھا رہتا تھا۔ صبح شام کا وقت تو اسی کے لئے وقف تھا۔ شہر کے بیسیوں آدمی آتے، بیٹھتے، باتیں کرتے، چائے حقہ پیتے مولانا کی صحبت اور گفتگو سے فیض اُٹھاتے۔ یوں بھی جس کا جس وقت جی چاہتا چلا آتا اور جو کام کرانا ہوتا کرا لیتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ بہت ضروری کام میں مصروف ہیں مگر لوگ آتے اور فضول وقت ضائع کرنے لگتے لیکن حالی ان کی دل آزاری کے ڈر سے کبھی خود وہاں سے اُٹھ کر نہیں جاتے تھے بلکہ اشارے کنائے سے بھی کوئی ایسی بات ظاہر نہ ہوتی جس سے لوگوں کو یہ خیال ہو کہ اُن کا بیٹھنا بار گزر رہا ہے۔ سفارشوں کے لئے لوگ بہت ستاتے تھے۔ اور اُن سے جہاں تک ہو سکتا سفارش کرنے سے دریغ

نہ کرتے تھے۔

اپنے سے چھوٹوں کی مولانا حالی ہمیشہ بڑی عزت کرتے تھے۔ اُن سے ادب اور عزت سے گفتگو کرتے۔ خط اس طرح لکھتے جیسے اپنے بزرگ یا برابر کے معزز دوست کو لکھا جا رہا ہو۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے "میں اور حمید الدین مرحوم اُن سے ملنے گئے تو وہ سروقد تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ ہم اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوئے۔ مولوی حمید الدین نے کہا بھی کہ آپ ہمیں تعظیم دے کر محجوب کرتے ہیں۔ فرمانے لگے آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں۔ آئندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔"

قابل اور ہونہار نوجوانوں کی بڑی قدر اور ہمت افزائی کرتے تھے۔ آج کل کے کئی بڑے بڑے ادیب اور شاعر ایسے ہیں جن کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی سب سے پہلے حالی نے کی۔ کوئی اچھی تحریر نظر سے گزرتی تو اُس کی تعریف کرتے اور لکھنے والے کا دل بڑھاتے۔ مولانا محمد علی اور ان کے اخبار ہمدرد کی بڑی تعریف اور قدر کرتے تھے۔ مولوی ظفر علی کے زمیندار اور اُن کی اُس وقت کی قومی خدمات سے خوش ہو کر ان کی تعریف میں ایک نظم لکھی۔ مولوی عبدالحق کے اخبار "افسر" کی تعریف اور اُس کے مضامین کی داد ان کے بہت سے اُن خطوں میں ملتی ہے جو انہوں نے مولوی عبدالحق کو لکھے ہیں۔

ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں "شیخ عبدالقادر صاحب تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں میں ایک ممتاز شخص ہیں اور میرے دوست ہیں۔ ان کو نہ صرف انگلش لٹریچر سے بلکہ اردو لٹریچر سے ایک خاص مناسبت ہے۔ اور اس کا ثبوت وہ مضمون ہے جو انہوں نے جدید اردو لٹریچر کے مصنفین پر لکھا ہے اور اس باب میں شمال مغربی اضلاع کے لوگوں پر جو کہ اپنے تئیں اُردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں اپنی فوقیت ثابت کر دی ہے۔ کیونکہ آج تک دلی سے لکھنؤ تک کسی شخص نے اس مضمون پر قلم نہیں اٹھایا۔ رہی یہ

بات کہ بعض جزئیات میں آپ نے ان سے اختلاف کیا ہے یہ اپنا اپنا مذاق .... ہے"

ایک خط میں خود مولوی عبدالحق کے مضمون کے بارے میں لکھا "آپ کا آرٹکل جو علی گڑھ کالج کی شورش کے متعلق پیسہ اخبار لاہور میں نکلا ہے میں نے کئی مرتبہ پڑھا. اس کا زور اور سچائی اور وضاحت دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی ..... سب سے زیادہ سچی بات جو آپ نے لکھی ہے وہ ٹرسٹیوں کی غفلت اور بے پروائی کا ذکر ہے..."

حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا ایک رسالہ "علمائے سلف" دیکھ کر اس کی بڑی تعریف کی "اس رسالے نے میرے دل میں آپ کی محبّت اور عظمت بہ نسبت سابق کے اضعاف مضاعفہ کر دی ہے۔ مسلمانوں کے لٹریچر میں اپنی طرز کی یہ پہلی کتاب ہے ..... آپ نے درحقیقت وہ کام کیا ہے جو انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر سموئل نے سلف ہلپ کے لکھنے میں کیا تھا ....."

مولوی خواجہ غلام الحسنین مرحوم اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے علمی و ادبی مذاق کو اُبھارنے اور اُن کو قومی کاموں کا شوق دلانے میں بھی حالی کا بڑا حصّہ اور اثر تھا۔ وہ اُن کی علمی ادبی سرگرمیوں سے بڑے خوش ہوتے اور ہمیشہ اُن کی ہمّت افزائی کرتے رہتے تھے۔

اگر کسی کی کوئی بات نامناسب یا غلط سمجھتے تو ایسی محبّت اور نرمی سے سمجھاتے تھے کہ اُسے ذرا سا ناگوار نہ ہو۔ مولوی ظفر علی خاں نے اپنے اخبار "دکن ریویو" میں مولانا شبلی کی کسی کتاب پر دو ایک مضمون لکھے اور اس میں "بے جا شوخی" سے کام لیا. یہ بات حالی کو نامناسب معلوم ہوئی۔ ایک مرتبہ وہ ملنے آئے تو مولانا حالی نہایت نرمی اور شفقت سے انہیں بڑی دیر سمجھاتے رہے اور وہ اس قدر شرمندہ ہوئے کہ سر نیچے سے اوپر نہ اٹھا سکے. حالی نے کہا "میں تنقید سے منع نہیں کرتا. تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہو گی۔

لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اُڑانا منصبِ تنقید کے خلاف ہے۔[1]"

مولانا حالیؔ کے بعض ہم عصروں کو ان کی یہ بات ناگوار تھی کہ وہ نوجوانوں کی اس قدر تعریف کرتے اور ان کے کاموں کی داد دینے میں اتنی فیاضی برتتے ہیں۔ اس سے ان کا دماغ پھر جاتا ہے۔ شاید اس پہلو کی طرف ان کی نظر نہیں جاتی تھی کہ ایسی تعریف دماغ خراب کرنے والی نہیں زندگی بنانے والی ہوتی ہے۔

اور یہی نہیں بلکہ حالیؔ میں اپنے ہم عصروں سے رشک اور رقابت کا بھی ذرا سا جذبہ نہ تھا۔ ادبی چشمک پرانی چیز ہے اور بہت ہی غیر معمولی سیرت و شخصیت کے آدمی کے سوا عام طور پر شاعروں اور ادیبوں کی آپس کی رقابت اتنی عام ہے کہ اس کا ثبوت دینے کی ضرورت نہیں۔ خود مولانا حالیؔ کے بعض ہم عصر اُن کی غیر معمولی علمی اور ادبی قابلیت اور عزت پر بڑا رشک کرتے تھے اور بعض تو اس رشک کو چھپا بھی نہیں سکے۔ لیکن مولانا حالیؔ کے دل میں اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کی بڑی عزت تھی۔ اور وہ بڑی فیاضی اور کھلے دل سے ان کی تعریف کرتے تھے۔ سرسید کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ لیکن مولوی نذیر احمد، مولانا شبلی، آزاد سب کے ساتھ اُن کا یہی روّیہ تھا۔ انہوں نے اپنے ہم عصروں کی کتابوں پر جو ریویو لکھے ہیں ان میں علمی دیانت اور دلی فیاضی کے ساتھ اُن کی خوبیوں کو سراہا ہے۔

ایک خط میں مولوی عبدالحق کو لکھتے ہیں "شمس العلماء مولانا شبلی کا تقرر مددگار معتمد امور مذہبی کے عہدے پر، عزیزی غلام الثقلین کی تحریر سے معلوم کرکے بے انتہا مسرّت ہوئی۔ اگر آپ اُن سے ملیں تو میری طرف سے بعد سلامِ نیاز کے کہہ دیجئے گا

---

[1] چند ہم عصر

کہ اگرچہ آپ کے علم و فضل و لیاقت کے مقابلے میں یہ عہدہ چنداں امتیاز نہیں رکھتا۔ مگر بہرحال لاہور کی خدمت سے جس پر مسٹر آرنلڈ آپ کو بلانا چاہتے تھے میرے نزدیک بہت بہتر ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ آپ کو تصنیف و تالیف کا یہاں زیادہ موقع ملے گا اور قوم کو آپ زیادہ فائدہ پہنچا سکیں گے۔"

مہمان کے آنے سے مولانا کو بہت خوشی ہوتی تھی۔ ان کے ہاں اکثر مہمان آتے رہتے اور وہ ہر ممکن آسائش جو اس کے لئے مہیا کر سکتے ضرور کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ ایک بار مولوی انوار احمد پانی پت گئے۔ جاڑے کا زمانہ تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ وہ حالی کے ہاں پہنچے تو دالان میں روئی کے پردے پڑ چکے تھے اور مولانا حالی فرش پر انگیٹھی کے سامنے بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اُٹھ کر ملے، مزاج پرسی کی، پاس بٹھایا، دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کھانے پر پانی پت کی مشہور بالائی منگا کر کھلائی اور سونے کے لئے بستر کرایا۔ بیچ رات میں مولوی انوار احمد کی آنکھ کھلی تو انہیں ایسا محسوس ہوا کہ کوئی اُن کی رضائی چھُو رہا ہے۔ پوچھا کون؟ تو حالی بولے آج سردی بہت ہے مجھے خیال ہوا، شاید آپ کے پاس اوڑھنے کو کافی نہ ہو تو یہ کمبل اُڑھا رہا تھا۔

حالی ہمیشہ علمی، ادبی اور قومی کاموں میں گھرے رہتے تھے لیکن اتنی مصروفیتوں کے باوجود اپنے خاندانی فرائض ادا کرنے کے لئے کسی نہ کسی طرح وقت نکال لیتے تھے۔

ان کا خاندان بہت بڑا تھا۔ اپنے بہن بھائی، رشتے کے بہن بھائی، اپنی اولاد، بھائیوں اور بہنوں کی اولاد اور ان سب کی اولاد کی اولاد۔ کئی سو آدمیوں کا حلقہ تھا جس کا مرکز حالی کی ذات تھی۔ وہ جیسی محبت اور جتنا خیال قریبی عزیزوں کا رکھتے اتنا ہی دُور کے رشتے داروں کا کرتے۔ لڑکوں کی تعلیم کا انتظام، تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ان کی ملازمت کی فکر حالی کے سر تھی۔ نسبت ناتے، شادی بیاہ، لڑائی جھگڑے ہر موقع پر اُن سے مدد لی جاتی تھی اور وہ بڑی خوش دلی سے مدد کرتے تھے۔ جب خاندان

میں دو فریقوں میں (ساس بہو، نند بھاوج، میاں بیوی وغیرہ) لڑائی ہوتی تو حالی پنچ بنائے جاتے۔ اور میں نے اپنی بزرگ عورتوں اور مردوں سے سُنا ہے کہ مولانا ہمیشہ اس خوبی سے فیصلہ کرتے کہ دونوں فریقوں میں سے کسی کو شکایت نہ ہوتی اور وہ مطمئن ہو جاتے تھے۔

اُن کو سوغات لانے کا بڑا شوق تھا۔ کہیں باہر جاتے تو ہمیشہ بہت سے تحفے تحائف لے کر آتے تھے۔ اور اکثر اتنی مقدار میں کہ سارے خاندان میں تقسیم کیے جاتے۔ پھل، مٹھائی، کپڑا، جوتے اور دوسری قسم کی چیزیں عزیزوں کے، خاص طور پر عورتوں کے لئے ضرور لاتے تھے۔ اور جب وطن سے باہر جاتے تو اپنے ہاں کی چیزیں مثلاً پانی پت کی بالائی، پانی پت کے بنے ہوئے چاندی کے خوبصورت اور سڈول موتی، یا سروتے اور وہاں کا بُنا ہوا کپڑا، تحفے کے طور پر دوستوں کے لئے جاتے تھے۔ جب خود ضعیفی کی وجہ سے باہر کم جانے لگے تو اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو تاکید کرتے رہتے تھے کہ فلاں فلاں چیزیں عزیزوں کے لئے لے کر آنا۔ اپنے والد کی تعلیم اور نمونے کے اثر سے خواجہ سجاد حسین کی بھی یہی حالت تھی کہ جب کبھی کہیں جاتے تھے تو ضرور وہاں کی تحفہ چیزیں لے کر آتے۔ اور اتنی لاتے کہ خاندان بھر میں بانٹی جا سکیں۔ مولانا حالی کو یوں تو سب ہی سے محبت تھی۔ مگر لڑکیوں پر خاص طور سے شفقت فرماتے تھے۔ خواجہ سجاد حسین نے لکھا ہے کہ سرسید اور حالی میں کئی صفات مشترک تھیں اُن میں سے ایک یہ تھی کہ "دونوں بزرگوں کو بچّوں اور اپنے رشتے داروں سے عموماً اور رشتے کی عورتوں سے خصوصاً بہت محبت تھی"۔ مولانا کے خط پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس وسیع دل میں کس کس کی محبت کے لئے کتنی گنجائش تھی۔ خواجہ سجاد حسین کے نام سینکڑوں خط ہیں اور ہر خط ان کی بے انتہا محبت اور شفقت آمیز نصیحتوں کا آئینہ ہے۔ دوسرے بہت سے عزیزوں کے نام بھی سینکڑوں خط ہیں جن کو پڑھ کر اجنبی اور ناواقف بھی بڑی آسانی سے اندازہ

لگا سکتا ہے کہ حالی کو خاندان کے ہر ہر فرد سے کتنا اُنس تھا اور سب کی فلاح و بہبود اور اصلاح کا کتنا خیال رہتا تھا۔ خواجہ سجاد حسین نوجوانی میں اپنی صحت کی طرف سے بے پروا تھے۔ اور اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ وہ اُن کو ہمیشہ حفظانِ صحت کے اصول اور دوا علاج کے بارے میں مشورہ دیتے رہتے تھے۔ ان کی آمدنی اچھی کافی تھی لیکن بڑے شاہ خرچ تھے۔ اس لئے ان کو کم خرچ کرنے کی صلاح دیتے اور تدبیریں بتایا کرتے۔ وہ خط لکھنے میں کوتاہی کرتے تو باپ کو بار بار انہیں تاکید کرنی پڑتی تھی۔ ایک دفعہ ناراض ہو کر لکھا کہ میری نہیں تو اپنی ماں کی خاطر ہی جلد جلد خط بھیجا کرو۔

خواجہ تصدق حسین مرحوم (جو مولانا حالی کے چچازاد بھائی کے بیٹے تھے) بڑے ہونہار اور قابل نوجوان تھے۔ اور حالی کی کوشش سے انہیں ایک اچھی جگہ مل گئی تھی۔ انہوں نے ایک خط میں جب اس بات کا شکریہ ادا کیا تو مولانا نے انہیں جواب میں لکھا "جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں یہ محض تمہاری سعادت مندی اور کسی قدر نادانی کی دلیل ہے۔ بفرضِ محال میری کوشش کو تمہاری کامیابی میں دخل ہو بھی تو اُس کو تقریباً ایسا ہی سمجھنا چاہئے جیسا کہ ایک باپ کی کوشش کو بیٹے کی کامیابی میں ہوتا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ اور ہوتا رہے گا"

کسی عزیز کا انتقال ہو جاتا تو اُس کے بچوں اور قریبی عزیزوں کو اس طرح تسلی دیتے اور اس انداز سے تعزیت کرتے کہ رنج و غم کم ہو اور فرائض کا احساس اور مرنے والے کی صفات کو اپنانے کا جذبہ زیادہ پیدا ہو۔ میرے دادا خواجہ غلام عباس کی وفات پر ان کے بیٹوں کو لکھتے ہیں۔

"اس حادثے سے تمہارے تمام خاندان کو جو صدمہ پہنچا ہے اس کو گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ خصوصاً تمہاری والدہ کی طرف سے جن کی

زندگی پہلے ہی سے خطرے میں چلی آتی ہے نہایت فکرمند اور پریشان ہوں۔ بہرحال سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں۔ تم تینوں صاحبوں کو بجائے اس کے کہ اس واقعہ جاں کاہ پر جزع و فزع کو کام فرماؤ اپنی ذمہ داریوں پر غور کرنا لازم ہے جو والد کی وفات سے تم پر عائد ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ امید ہے کہ تم بہ اتفاق ہم دگر اس بوجھ کو اچھی طرح اٹھاؤ گے اور جس طرح علمی زندگی میں تم نے حسن قبول کا درجہ حاصل کیا ہے اسی طرح خانگی زندگی میں قبولیت کا مرتبہ حاصل کرو گے۔۔۔۔۔"

ایسا کون انسان ہو گا جسے خاندان والوں سے کچھ نہ کچھ تکلیف اور رنج نہ پہنچا ہو۔ خصوصاً جو لوگ علم اور مرتبے میں بڑھ جاتے ہیں ان کو خاندان کی مخالفت اور بھی زیادہ سہنی پڑتی ہے۔ حالی کے خیالات اس بارے میں کیا تھے۔ اور ان کا عمل کیا تھا؟ وہ بھی سنیئے۔ اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں:۔

"جب سے گھر پر رہنے کا اتفاق ہوا ہے مجھے کلی یقین ہو گیا ہے کہ جب تک ایک تعلیم یافتہ آدمی جو بسبب تعلیم کے اپنی سوسائٹی سے بہت آگے بڑھ گیا ہے، خانگی مکروہات کو نہایت صبر و تحمل کے ساتھ برداشت نہ کرے اور عمداً گونگا اور بہرا نہ بن جائے اس وقت تک اس کا اپنی سوسائٹی میں گزارا کرنا ناممکن ہے۔ ہم بھی صبح سے شام تک اس قسم کی مخالف آوازیں سنتے رہتے ہیں اور اول اول ہم کو بھی وہ نہایت تلخ اور ناگوار معلوم ہوتی تھیں۔ مگر آخرکار معلوم ہو گیا کہ موجودہ حالت میں ہم کو ان مکروہات سے کسی طرح نجات نہیں اور اس لئے ان پر صبر کرنا ناگزیر ہے۔ ہماری عورتیں اور مرد اپنے حقوق اور فرائض سے بالکل ناواقف ہیں اور اس لئے اپنے حقوق کی حد سے اکثر متجاوز ہو جاتے اور اپنے فرائض ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ پس بہ نسبت اس کے کہ ان کی شکایت کی جائے وہ درگزر کے زیادہ مستحق ہیں۔"

مولانا حالیؔ کے حالات بزرگوں سے سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ یوں تو وہ سبھی کو چاہتے تھے لیکن انہیں اپنی چھوٹی بہو اور بڑی پوتی مشتاق فاطمہ سے خاص طور پر دلی محبّت تھی۔ ان دونوں کے خصوصاً پوتی کے نام خطوں سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ ان میں نصیحتیں ہیں، ہدایتیں ہیں۔ کہیں کہیں ہلکی سی تنبیہہ بھی ہے۔ مگر ایک ایک لفظ سے محبّت ٹپکی پڑتی ہے۔

پوتی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "تم نے اتنی دور جا کر اپنی محبّت سب کے دل میں بہت بڑھا دی ہے۔ تمہاری دادی ہر وقت تمہاری صحت و سلامتی کی دعا کرتی رہتی ہیں۔ تم مجھے صاف صاف لکھو کہ اُس ملک (حیدر آباد) کی آب و ہوا کا تم اپنے اوپر کیسا اثر پاتی ہو۔ مجھے امید ہے کہ وہاں رہنے سے تمہاری صحت اچھی ہو جائے گی۔ کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کر آؤ کہ یہاں تمہیں کوئی پہچان نہ سکے اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین دلاؤ کہ میں وہی مشتاق فاطمہ ہوں"۔

ایک دوسرے خط میں "میرا جی بہت خوش ہوا کہ تم نے ہر ایک کام کے لئے الگ الگ وقت باندھ رکھے ہیں۔ اور کسی وقت بے کار نہیں رہتیں۔ خدا تعالےٰ نے دین اور دنیا کی بھلائی اسی میں رکھی ہے کہ آدمی بے کار نہ رہے اور وقت کو عزیز سمجھے۔ جتنے گناہ بے کار آدمی کرتے ہیں اتنے کام والے نہیں کرتے اور جتنے بیمار بے کار آدمی رہتے ہیں اتنے کام والے نہیں ہوتے ......"

"گھبرانا ہرگز نہیں چاہیئے ..... میں انشاء اللہ تعالےٰ بہت جلد تمہارے واسطے پڑھنے کے لئے کتابیں بھیجوں گا جن سے تمہارا جی بہلے گا ....."

مشتاق فاطمہ پہلی بار حیدر آباد جاتے ہوئے دہلی اپنے چچا کے پاس ٹھیریں جسب دستور وطن میں سب عزیز رخصتی کے وقت خوب روئے رُلائے تھے۔ خواجہ سجاد حسین کو اس موقع پر لکھتے ہیں کہ مشتاق فاطمہ "جب تک دہلی ٹھیری رہے۔ سب کو تاکید

کرو۔ کہ اُس کے سامنے رنج وغم کی باتیں نہ کریں بلکہ ایسی باتیں کریں جن سے اس کے دل کو تقویت ہو اور حزن وملال زیادہ نہ ہو۔ یہاں آٹھ سات روز تک عورتوں نے اُس کو دن بھر بلکہ رات بھر بھی رُلایا ہے' اندیشہ ہے کہ وہ خدا نہ خواستہ علیل نہ ہو جائے۔"

مولانا حالی کے دو نواسے تھے۔ فرزند علی اور عبدالولی۔ نواسوں کی تعلیم وتربیت کا سارا بار مولانا ہی پر تھا کیونکہ ان کے والد اپنی بیوی اور اولاد کی طرف سے بالکل لاپرواہ اور بے تعلق تھے۔ عبدالولی بچپن سے بڑے ذہین اور لکھنے پڑھنے کے بے حد شوقین تھے لیکن بدقسمتی سے وہ آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد ہی مرگی کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مولانا حالی نے ہزارہا قسم کے علاج معالجے کرائے' دنیا بھر کی تدبیریں کیں لیکن اُن کو صحت نہ ہوئی اور وہ بیچارے آخر عمر تک اس موذی مرض میں مبتلا رہے۔ حالی کو اُن کی ذہانت اور تیزی کی وجہ سے بچپن ہی سے اُن سے بہت محبت تھی۔ بعد میں اُن کے اس روح فرسا مرض اور ان کی بے بسی اور لاچاری کے سبب اس محبت میں انتہائی دردمندی بھی شامل ہو گئی تھی۔ بیماری نے خواجہ عبدالولی کا مزاج بہت چڑچڑا کر دیا تھا اور بعض اوقات تو اُن پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور اس حالت میں وہ اپنے نانا اور ماں کو بہت پریشان کرتے تھے اور کبھی کبھی گستاخی تک کر بیٹھتے تھے۔ مگر مولانا نہ صرف ان کی باتیں برداشت کرتے بلکہ خوش دلی اور خندہ پیشانی سے سہتے تھے۔ ایک مرتبہ خواجہ عبدالولی نے مولانا سے گستاخی کی اور انہیں شاید دھکا دیا جس سے مولانا گر پڑے۔ خواجہ سجاد حسین اُس وقت موجود تھے۔ اُن کا مزاج بڑا حلیم تھا لیکن وہ کسی کی بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بھانجے کو ڈانٹا اور ایک طمانچہ بھی مارا۔ حالی کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور جب تک خواجہ صاحب نے بھانجے کو منا نہیں لیا۔ حالی نے اپنے لائق فائق سعادت مند بیٹے سے بات نہیں کی۔ اُن کی بیماری پر مولانا نے ہزاروں

روپیہ صرف کیا اور اُن کی ناز برداری اور تیمار داری میں اپنی زندگی تلخ کرلی مگر اس بیماری کے مارے غم زدہ نوجوان کی ذرا سی دل آزاری کبھی گوارا نہیں کی۔ ان کے بیشتر خطوں میں اپنے ان نواسے کا ذکر ملتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے اُنہیں اُن سے کتنی محبت تھی اور ان کی بیماری کا کیسا سخت قلق تھا۔ خواجہ عبدالولی مرحوم اکثر اپنے نانا کا ذکر بڑی محبت اور احترام سے کیا کرتے تھے اور ہمیشہ ذکر کرتے وقت ان کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتی تھیں۔

خواجہ فرزند علی مولانا کے بڑے نواسے تھے۔ وہ کھیل کود کے بڑے شوقین تھے اسکول کی بندشوں سے گھبراتے اور کتابی تعلیم سے بھاگتے تھے۔ مولانا کو ان کی تعلیم کی بڑی فکر رہتی تھی اور وہ ہر طرح اس کی کوشش کرتے تھے کہ ان کا دل لکھنے پڑھنے میں لگے۔ خواجہ سجاد حسین اور خواجہ تصدق حسین کے نام کے سینکڑوں خطوں میں ان کا ذکر ہے۔ مولانا حالیؔ نے ہر ممکن کوشش کی وہ اعلےٰ تعلیم پائیں آخر اس کی طرف ان کی توجہ نہ دیکھ کر انہیں ایف اے کے بعد انجنیئرنگ میں بھیجدیا تھا جہاں انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ خواجہ فرزند علی مرحوم بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ دیکھو مولانا حالیؔ کو مجھ سے کتنی محبت اور میرا کتنا خیال تھا کہ تقریباً ہر خط میں میرا ذکر موجود ہے۔

مولانا حالیؔ کے بڑے بیٹے خواجہ اخلاق حسین ایک صوفی منش بزرگ تھے اور خاندانی معاملات اور بچّوں کی تعلیم وغیرہ کی فکر سے آزاد۔ اس لئے ان کے دونوں بیٹوں خواجہ احقاق حسین اور خواجہ اکرام حسین کی تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری بھی مولانا حالیؔ ہی پر تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "حقن (احقاق حسین) انگریزی میں تو چل نکلا ہے مگر حساب میں ابھی تک صفر ہے۔ ابھی دھیان اور توجہ لکھنے پڑھنے میں پیدا نہیں ہوئی لیکن خصلتیں عمدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اطاعت اور حکم برداری مزاج میں بہت ہے، کاہل نہیں ہے۔ اور روز بروز غریب ہوتا جاتا ہے، گھر جانے کا کبھی

نام نہیں لیتا۔ جس بات کو منع کرو پھر نہیں کرتا۔۔۔۔۔اگر اس کے دل میں کچھ شوق اور توجہ پیدا ہو جائے تو اُسے علی گڑھ ظہور حسین وارڈ میں داخل کر دیا جائے۔"

رشتے کے ایک پوتے کے فیل ہونے کی خبر سنی تو بہت صدمہ ہوا۔ اُن کے والد کو خط لکھا جس میں اظہارِ افسوس کے ساتھ ہی کس دلسوزی سے لکھتے ہیں" طالب علم کتنا ہی بدشوق ہو مگر فیل ہونے کا رنج و ملال سب کو یکساں ہوتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے اُس کی دل جوئی کرنی چاہیئے اور ملامت و نفرین سے احتراز کرنا چاہیئے۔۔۔۔۔ کہدینا رنج کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہایت استقلال سے پھر کوشش کرو۔ انشاء اللہ تعالےٰ ضرور کامیاب ہوگے۔"

ہمیشہ لڑکوں اور بچّوں کے خطوں کا جواب اُسی پابندی سے دیتے جیسے بڑے آدمیوں کے خطوں کا۔ اُن کا طرزِ تحریر یوں بھی سادہ، شستہ اور آسان ہے لیکن عورتوں اور بچّوں کو جب خط لکھتے تو خاص طور پر وہ لہجہ اور زبان استعمال کرتے تھے جس کو وہ اچھی طرح سمجھ سکیں۔ اور ساتھ ہی اس کی کوشش بھی کرتے تھے کہ بہت خوش خط اور صاف صاف لکھیں تاکہ انہیں پڑھنے میں آسانی ہو۔

خواجہ فرزند علی کو لکھتے ہیں" میری جان اب کے لکھنے پڑھنے میں ایسی کوشش کرو کہ امتحان کے موقع پر پورا پورا اطمینان رہے۔"

بڑھاپے کا زمانہ ہے۔ آنکھ کی بینائی بہت کم ہو گئی ہے، لکھنا پڑھنا بہت مشکل معلوم ہونے لگا ہے۔ لیکن جب کسی کا خط آئے جواب دینا ضروری ہے۔ خواجہ اخلاق حسین کو لکھتے ہیں۔" مجھے اب ایک ایک حرف لکھنا دشوار ہو گیا ہے اس وجہ سے تمہیں خط نہیں لکھا تھا۔ تم بچّوں کی طرح خفگی اور ناراضگی کا خیال دل میں نہ لایا کرو میں تم سے ناراض ہوں گا تو راضی کس سے ہوں گا۔"

اکثر عید بقرعید کے موقع پر خاندان بھر کی لڑکیاں بالیاں مولانا کے ہاں جمع

ہوتیں۔ رات گئے تک سب کے ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگتی رہتی۔ جب سب کے مہندی لگ چکتی تو ایک لڑکی ایسی رہ جاتی جس کا ایک ہاتھ مہندی لگنے اور کپڑا باندھا جانے سے باقی رہ جاتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ اُس وقت مولانا حالی اوپر اپنے کمرے سے اپنی چلم بھرنے نیچے کے گھر میں آجاتے اور پوچھتے "بھئی اب تک کیا ہو رہا ہے" لڑکیاں کہتیں! بابا سب کے مہندی لگ گئی بس اس کا ایک ہاتھ رہ گیا ہے۔ کہتے اچھا لاؤ ہم لگا دیں۔ (یا ہاتھ باندھ دیں) اور خود لڑکی کے ہاتھ میں مہندی لگا کر اُس پر کپڑا باندھ کر خوش ہوتے ہوئے واپس چلے جاتے۔

مولانا حالی کو بڑی عمر کے بچّوں ہی سے نہیں ننھے بچّوں سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ بچّے جب بڑے ہو جاتے اُسی وقت وہ ان سے زیادہ بے تکلّف نہیں ہوتے تھے اور بچّے بھی عموماً مولانا کے سامنے مرعوب اور باادب رہتے تھے۔ لیکن چھوٹے بچّوں سے انہیں بڑی دلچسپی اور بہت محبّت تھی۔ جیسے ہی خاندان میں کوئی بچّہ پیدا ہوتا وہ جاکر اُسے دیکھتے، اُٹھا کر اُسے پیار کرتے اور گود میں لے کر بیٹھے رہتے اور پھر عرصے تک یہ ننھا بچّہ ان کی توجہ اور الفت کا مرکز بنا رہتا۔ ننھے بچّے اکثر اُن کے پاس جاکر کھیلا کرتے اور اُن کو ستاتے لیکن مولانا اس سے ذرا بھی پریشان نہ ہوتے تھے بلکہ بہت دلچسپی سے ان کی حرکتیں دیکھتے رہتے۔ ایک خط میں اپنی نواسی کے بچے کے بارے میں لکھتے ہیں "محمود اس وقت بہت تنگ کر رہا ہے اور خط نہیں لکھنے دیتا۔ اس لئے خط کو ختم کرتا ہوں۔"

خواجہ غلام السیّدین ان کی پوتی کے بڑے بیٹے ہیں۔ اس لئے خاندان بھر کے لاڈلے تھے۔ جب ماں اپنے دادا کے ہاں جاتیں تو نیچے کے مکان میں دادی کے پاس ٹھیرا کرتی تھیں۔ اوپر دیوان خانے میں مولانا حالی رہتے تھے۔ سیّدین مولانا سے بہت مانوس تھے۔ جب وہ نیچے سے اوپر چلے جاتے تو یہ نیچے سے پکارتے "بابا" اور مولانا

آواز سن کر نیچے اُترتے، بچّے کو پیار کرتے اور پھر اُوپر چلے جاتے، سیدین پھر پکارتے "بابا" اور وہ پھر اسی طرح نیچے آتے، پیار کرتے اور اُوپر چلے جاتے۔ بچّوں کو تو کسی بات کی تکرار ہی میں مزا آتا ہے۔ والدہ مرحومہ سنایا کرتی تھیں کہ سیدین جتنی مرتبہ انہیں "بابا" کہہ کر بلاتا وہ اس ضعیفی کے عالم میں ہر مرتبہ نیچے اُتر کر آتے اور اُسے پیار کرتے تھے۔"

سیدین صاحب کی چھوٹی بہن سیدہ خاتون مرحوم، بڑی پیاری، بھولی اور ذہین بچّی تھی۔ اور مولانا حالیؔ اس بچّی کو بے حد چاہتے تھے۔ انہوں نے سیدہ خاتون پر ایک چالیس بیت کی نظم بھی لکھی ہے۔ جو علاوہ ذاتی لحاظ سے دلچسپ ہونے کے ان کے مشاہدے کی باریکی پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

سیّدہ کیسی پیاری بچّی ہے　　　صورت اچھی، سجھ بھی اچھی ہے
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان　　　پر ہے اچھے بُرے کی سب پہچان

اس نظم کو پڑھ کر جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچّی سے مولانا کو کس قدر لگاؤ تھا۔ وہاں یہ اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ وہ بچّوں کی طبعیت اور نفسیات کو بھی خوب سمجھتے تھے۔

جھوٹ موٹ اُس کو گر ڈراتے ہیں　　　بات ڈر کی کوئی سناتے ہیں
پکّے پن سے یقیں نہیں کرتی　　　دیر تک ہے نہیں نہیں کرتی

اور :-

اوپری شکل سے ہے گھبراتی　　　ہے مگر جلد سب سے ہل جاتی

اُوپر تلے کے بھائی بہن میں جو مزیدار لاگ ہوتی ہے۔ اس کا ذکر دیکھئے :-

پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اُس کو　　　کیوں کہ اُوپر تلے کے ہیں دونوں
بس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا　　　اور وہیں اُس نے ہاتھ پھیلایا

جا لپٹتی ہے دوڑ کر ماں سے
بھائی سے کہتی ہے ہٹو یاں سے

اور کس پیار بھرے انداز میں بچّی کی توتلی زبان کی تعریف کرتے ہیں :۔

یوں تو تھی جب ہی پیاری اُسکی زباں
جب کہ کرنے لگی تھی وہ غوغاں

پھر تو آتا ہے اُس پہ اور بھی پیار
ہوتی جاتی ہے جس قدر ہشیار

نہیں منہ سے نکلتے پورے بول
بولتی ہے سدا ادھورے بول

ٹوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب
زرگری اپنی بولتی ہے جب

اس پوری نظم کو پڑھیئے ...... معلوم ہوتا ہے کوئی بچّوں کی سیدھی سادی پیاری زبان میں اُن سے باتیں کر رہا ہے۔

اپنے بزرگوں سے میں نے ایک دلچسپ قصّہ سنا ہے۔ برسات کا زمانہ تھا، گرج چمک ہو رہی تھی۔ مولانا حالی دالان کے بیچ کے در کے سامنے تخت پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے اور سیدہ خاتون جو اس وقت شاید سال بھر کی تھیں ان کی گود میں لیٹی اپنی "غوغاں" سے ان کا دل لبھا رہی تھیں۔ پاس ہی تخت پر کانسی کا ایک خالی پیالہ رکھا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ہی بڑے زور کا تڑاخا ہوا۔ ایک شعلہ سا چمکا۔ بجلی پیالے پر گرتی، مولانا کی گود میں لیٹی ہوئی بچی کے بھورے بالوں کو جلاتی ہوئی، سہ دری کے روشن دان سے باہر نکل گئی۔ سہ دری میں ریشمی کپڑوں کا جو بکس رکھا تھا جب اس کو کھولا گیا تو اندر سے سارے کپڑے محض راکھ کا ڈھیر تھے۔ مگر خدا کی قدرت کہ مولانا اور بچی دونوں بالکل محفوظ رہے۔ اور سوا سیدہ مرحومہ کے چند بالوں کے "بال بال" بچ گئے۔

حالی ۱۳۰۰ء میں کچھ عرصے کے لئے فرید آباد جا کر رہے تھے۔ وہاں سے جو خط لکھے ہیں اُس میں بار بار اپنی پرنواسی احمد فاطمہ کا جو اس وقت دودھ پیتی بچی تھی ذکر لکھتے ہیں۔" احمد فاطمہ طالعمرہا اکثر یاد آتی ہے۔ امید ہے کہ عنقریب اُسے

پہلے سے زیادہ تماشے کرتے دیکھوں گا۔"

"اگر احمد فاطمہ اور اظہر عباس طالعہ ہا کے ٹیکا اب تک نہ لگا ہو تو اب ضرور لگوا دینا۔"

احمد فاطمہ کا دودھ چھٹا تو ظاہر ہے کہ بچّی پریشان ہو گی۔ اس معمولی بات کا ایسا گہرا اثر لیتے ہیں:-

" امدو طالعہ ہا کا پرسوں دودھ چھٹا دیا ہے۔ سنا ہے کہ ایک رات اور ایک دن نہایت سخت گزرا۔ کل سے وہ حال نہیں پر حد سے زیادہ نازک مزاج ہو گئی ہے۔ صبح سے دو مرتبہ میرے پاس آچکی ہے۔ آتے ہی پھر گھبرا کر چلی جاتی ہے۔"

اور پھر یہ محبت صرف اپنے بچّوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اپنے پرائے سب کے بچّے اس شفقت سے فیض یاب ہوتے تھے۔ گھر میں کوئی مہمان آیا ہوا ہو، کسی ملازمہ کا یا مہترانی کا بچہ کہیں پڑا ہوا دیکھ لیں سب سے دلچسپی اور شفقت کا اظہار کرتے تھے۔ بچّوں کی تکلیف سے تو ایسے بے قرار ہو جاتے تھے کہ کوئی اپنی تکلیف سے بھی نہ ہو گا۔ فرید آباد کے قیام کے دوران میں ان کے مکان کے باہر کسی کوٹھری میں ایک عورت وزیرن مع اپنے بال بچّوں کے رہتی تھی۔ ایک دن اس کا چھوٹا بچہ بیمار ہو گیا اور رات بھر روتا رہا۔ مولانا حالی نے آواز سنی تو بے چین ہو گئے۔ نومبر کا مہینہ، شدید سردی، اٹھتّر سال کی عمر مگر نہ رہا گیا۔ اُٹھے، باہر نکل کر وزیرن کو آواز دی، بچّے کا حال پوچھا اور کہا ڈاکٹر کو بلاؤں۔ اُس نے کہا مولوی جی صبح کو دیکھا جائے گا۔ مولانا وزیرن کو تسلّی تشفی دے کر چلے تو آئے مگر رات بھر بچّے کے خیال سے بے چین رہے اور صبح ہی ڈاکٹر لیاقت حسین کو وزیرن کے ہاں بھیجا اور جب تک بچہ اچھا نہ ہو گیا برابر اُن پر تاکید کرتے رہے کہ بچّے کا خیال سے علاج کریں۔

ایک اور واقعہ اس سے بھی زیادہ پُر اثر ہے۔ پانی پت میں ایک مرتبہ حالی کسی

جگہ سے تانگے میں بیٹھے گزر رہے تھے کہ دیکھا ایک بھنگی کا چھوٹا سا لڑکا نالی میں گر پڑا ہے۔ اور کیچڑ و گندگی میں لت پت پڑا چلا رہا ہے۔ آس پاس بہت سے آدمی جمع کھڑے دیکھ رہے تھے اور رام رام کر رہے تھے مگر کوئی اُسے اُٹھاتا نہیں۔ مولانا نے فوراً اپنا تانگہ ٹھیرایا۔ پاس گئے بڑی آہستگی سے اُسے نالی میں سے نکالا۔ اپنے ہاتھ سے اُس کے کپڑے اتارے اور اُس کے ماں باپ کا پتہ پوچھ کر خود وہاں چھوڑ کر آئے۔ چلتے ہوئے لوگوں سے کہا "جس رام کا نام آپ جپ رہے ہیں اگر چاہتے تو اُسی رام کا جلوہ اس ننھے بچے میں آپ کو نظر آ سکتا تھا۔" یہ ایک جملہ ایک کتاب پر بھاری ہے۔

اپنے ملازموں کے ساتھ مولانا حالی کا جو سلوک تھا اُس کی مثال بہت مشکل سے ملے گی۔ وہ ان کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے اور ان کے کھانے پہننے اور آرام وغیرہ کا لحاظ اس طرح رکھتے جیسے اپنے بچوں کا اور اُن کی عزت اور اُن کے ساتھ سلوک ایسا کرتے جیسے برابر کے دوست یا عزیز کا۔ یوں تو کئی نوکر اُن کے پاس رہے مگر دو ملازم اُن کے خاص تھے۔ ایک نانوں خاں دوسرا عطا اللہ، نانوں خاں کبھی کبھی خواجہ سجاد حسین کے ساتھ ان کی ملازمت پر بھی جایا کرتا تھا۔ خواجہ سجاد حسین کے نام کے پچاسیوں خطوں میں نانوں خاں کا ذکر، اُس کے بال بچوں کی خیریت، اُسے دعا سلام وغیرہ لکھا ہوا ملے گا۔ نہ جاننے والے کو یہ خیال بھی نہ ہو گا کہ اس پابندی دل سوزی اور لگن سے ایک ملازم کی پرسش کی جا رہی ہے۔ "نانوں خاں کو دعا کہنا اور آرام سے رکھنا"۔ "اس کو چاہیئے کہ پانی پت خط برابر لکھتا رہے"۔

"نانوں خاں کے بچے کا کل سے کچھ حال نہیں معلوم ہوا۔ شاید کل یا پرسوں وہ آیا تھا کہتا تھا بچے کا دم چلتا ہے۔ مجھے بھی اُس کے بچنے کے کچھ آثار معلوم

نہیں ہوتے۔" خواجہ سجاد حسین بیمار تھے اور خط کا جلدی جواب نہیں دیتے تھے۔ نانوں خاں نے مولانا کو ان کی طبیعت کا حال لکھا تو انہوں نے اُس کا بہت شکریہ ادا کیا اور ہدایت کی کہ برابر اسی طرح خط لکھتے اور مجھے اطلاع دیتے رہا کرو۔ بعد میں وہ مولانا حالی کے پاس ہی آگیا تھا اور اُن کی وفات تک اُن کے پاس رہا۔ مولانا کے انتقال کے بعد نانوں خاں اکثر اُن کا ذکر کر کے رویا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے یہ قصہ سنایا کہ مٹی کا تیل نیا نیا چلا تھا۔ تیل کی ڈبیا ٹپکتی تھی جو ایک رکابی میں رکھی تھی۔ کسی نے ڈبیا ہٹالی۔ نانوں خاں آئے، دیکھا رکابی میں پگھلا ہوا گھی رکھا ہے۔ جھٹ اُٹھایا اور پی گئے۔ اب جو بدبو آئی تو سمجھے کہ گھی کے دھوکے میں مٹی کا تیل پی گئے۔ رُوتے دھُوتے مولانا حالی کے پاس پہنچے اور بولے بس میاں اب تو ہم مرلئے... پیٹ میں بڑا سخت درد ہو رہا ہے۔ انہوں نے پوچھا تو سارا حال سُنایا۔ مولانا کو بھی معلوم نہ تھا کہ مٹی کے تیل کی خاصیت کیا ہے۔ بے حد گھبرائے، اسی وقت حکیم کو بلایا اور نانوں خاں کی تیمارداری میں لگ گئے۔ اُسی دن مولانا حالی کو نواب لوہارو کے ہاں دعوت میں جانا تھا۔ دیر ہوئی تو نواب صاحب کا آدمی بلانے آیا۔ حالی نے انہیں معذرت لکھ بھیجی کہ "افسوس ہے حاضر نہیں ہو سکتا۔ نانوں خاں مٹی کا تیل پی گیا ہے اور میں اُس کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔"

سردی کا زمانہ تھا..... نانوں خاں پرانے کپڑوں میں اکڑتا پھر رہا تھا۔ حالی نے پوچھا نانوں خاں کوئی گرم کپڑا نہیں بنایا؟ اُس نے جواب دیا گنجائش نہیں بناؤں کہاں سے؟ مولانا نے فوراً روئی کی جو نئی واسکٹ پہنے تھے اُتار کر اُسے پہنا دی۔

نانوں خاں کہا کرتا تھا مولوی صاحب تو ولی تھے ولی۔ اب ایسے آدمی ڈھونڈے نہیں ملتے۔ انہوں نے کبھی مجھے نہ کوئی سخت لفظ کہا نہ

کبھی خفا ہوئے۔

مولانا حالی کا دوسرا چہیتا ملازم عطاء اللہ تھا۔ وہ عرصے سے مولانا کے پاس رہتا تھا اور اُن کے انتقال کے بعد جب تک زندہ رہا خواجہ سجاد حسین کے پاس رہا۔ میں نے بھی اُسے دیکھا تھا۔ کانوں سے اس قدر اونچا سنتا تھا کہ چیختے چیختے گلا پھٹ جاتا لیکن اُس کا سُن لینا محض حُسنِ اتفاق تھا۔ ایک ٹانگ بالکل بیکار تھی۔ ہاتھوں میں بھی کچھ نقص تھا اور مزاج اس قدر خراب تھا کہ خدا کی پناہ۔ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا اور خوب چیختا چلاتا۔ بات نہ سنتا تھا نہ سمجھتا تھا، کام اچھی طرح سے نہ کر سکتا تھا لیکن اپنی حمایت میں لڑنے کو ہمیشہ تیار رہتا۔ شاید اُس کے اِن نقائص ہی کی وجہ سے حالی کو اُس سے خاص ہمدردی اور محبت تھی۔ وہ اُس کی ہر بد مزاجی، کام چوری اور ہاتھ چالاکی کو خندہ پیشانی سے سہہ لیتے تھے۔ ساری عمر اُسے اپنے سے جدا نہیں کیا اور نہ کبھی اُسے ڈانٹا نہ اس سے ناراض ہوئے۔ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی کے حالی سے بہت تعلقات تھے۔ سالہا سال تک ان کا یہ معمول تھا کہ روزانہ صبح شام مولانا کے ہاں آتے اور گھنٹوں بیٹھتے۔ انہوں نے عطاء اللہ کی ساری صفات خوب دیکھی تھیں۔ ایک مرتبہ کہنے لگے "اگر علاوہ اور خوبیوں کے عطاء اللہ اندھا بھی ہوتا تو بلا مبالغہ مولانا کے نقطۂ خیال سے اُس میں ایک اور خوبی کا اضافہ ہو جاتا۔

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے اپنی کتاب تذکرۂ حالی میں عطاء اللہ کی زبانی لکھا ہے "اجی تم سے کیا کہوں.... مولوی صاحب بڑے اچھے آدمی تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ چیز بازار سے منگائی اور روپیہ دیا۔ میں نے باقی کے پیسے لاکر دیئے تو کبھی پیسے گنے نہیں.... مولوی صاحب کو چائے پینے کی بہت عادت تھی اور اس کے لئے چینی اور بسکٹ بہت آتے رہتے تھے۔ چائے میں ہی تیار کرتا تھا اور

بسکٹ وغیرہ میری کوٹھری میں ایک صندوق میں رکھے رہتے تھے۔ میرا جب جی چاہتا یا بھوک لگتی تو بسکٹ نکال کر کھا لیا کرتا۔ گرمی کا موسم ہوتا تو چینی کا شربت بنا کر پیا کرتا۔ اس طرح چینی اور بسکٹ جلدی سے ختم ہو جاتے۔ جب کوئی چیز نہ رہتی تو میں مولوی صاحب سے کہتا۔ مولوی صاحب اشارے سے کہتے اچھا اور منگا دیں گے۔ کبھی انہوں نے یہ نہ کہا ابھی تو چیز منگائی تھی اتنی جلدی کیسے ختم ہو گئی..... اپنے پہننے کے کپڑے مجھے ہمیشہ پہننے کو دیا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سردی کے موسم میں میں نے شکایت کی کہ رات کو بڑی سردی لگتی ہے مولوی صاحب نے فوراً اپنی رضائی جو ابھی نئی بنوائی تھی کھونٹی سے اتار کر مجھے دیدی۔ میں نے کہا یہ تو ابھی کل ہی آئی ہے۔ مجھے کوئی پرانی رضائی دے دو۔ کہنے لگے نہیں یہ تم لے لو۔ ہم اور بنوا لیں گے.....“

مولانا حالی کی وفات کے بعد خواجہ سجاد حسین بھی عطاء اللہ کو اپنے والد کا عزیز ملازم سمجھ کر بڑی عزت کرتے اور اُس کی بدمزاجیوں کو صبر سے سہتے تھے۔ گھر میں کسی کی مجال نہیں تھی کہ عطاء اللہ کو کچھ کہہ سکے۔

مولانا حالی کے مکان کے دروازے میں ایک کوٹھری تھی جس میں ایک غریب عورت رہتی تھی۔ یہ شاید جوگیوں میں سے تھی اور اُس نے فقیری لے رکھی تھی۔ احترام کے طور پر اُسے نہ صرف بچے بلکہ خود حالی "مامی" (ممانی) کہتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ عطاء اللہ کی چیخ پکار سُن کر وہ اپنے ہاں سے نکل کر آتی اور کہتی مولوی صاحب آج عطاء اللہ کو بڑا غصہ ہے۔ فرماتے ہاں بھئی کبھی ہم اُس پر ناراض ہو لیتے ہیں کبھی وہ ہم پر۔ آج اُس کی باری ہے۔ مامی کا بیان ہے کہ میں جب کبھی اُن کے پاس جاتی۔ تو پہلے خود سلام کرتے اور بڑے اخلاق سے باتیں کرتے۔ اکثر روپیہ دیتے۔ کبھی کبھی فرمائش کرکے مچھلی پکواتے

اور تیل کی مچھلی بڑی رغبت اور تعریف سے کھاتے۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے کبھی بھی اُن کے منہ سے کوئی برا لفظ گالی یا کوسنا نہیں سُنا۔

صرف اپنے ملازم ہی نہیں دوسرے عزیزوں کے ملازموں کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے۔ کوئی عورت کسی عزیز خاتون کے ساتھ پردیس جاتی تو ہمیشہ اُس کے کنبے بھر کی خیریت اور حال احوال لکھتے رہتے۔ اُس کو تسلی تشفی کرتے۔ چھوٹے چھوٹے ملازم بچے جو اکثر گھروں میں رہا کرتے ہیں۔ اُنہیں تو بالکل اسی طرح چاہتے تھے جیسے اپنے بچوں کو۔

مولوی عبدالحق صاحب نے لکھا ہے کہ حالی کی سیرت کی دو نمایاں خصوصیتیں تھیں۔ سادگی اور دردِ دل۔

سادگی بیان میں، زبان میں، نظم میں نثر میں، کردار میں گفتار میں، ہر جگہ اور ہر موقع پر دیکھ لیجئے۔

اور دردِ دل تو وہ صفت ہے جس کا پرتو اُن کی زندگی کے ہر ہر گوشے میں نظر آتا ہے۔ اُن کی ساری زندگی ہمدردی، دردمندی، رقتِ قلب، ایثار اور فیاضی سے عبارت تھی۔ سچّے ایثار کی صفت اُس شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جسے دردِ دل کی انمول دولت میسّر ہو۔ حالی کسی کی ذرا سی تکلیف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اور اس سے اس طرح بے چین ہو جاتے گویا یہ اُن ہی پر بیت رہی ہے۔ وہ اپنے اس شعر کی آپ ہی تفسیر تھے ؎

چیست انسانی؟ تپیدن از غمِ ہمسائگاں	از سمومِ نجد در باغِ عدن پژمان شدن

جنگ بلقان کے زمانے میں جب ترکوں کی مصیبتوں اور نقصانات کا حال پڑھتے تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ حیدر آباد میں سیلاب آیا تو اُس کی تباہ کاریوں نے پانی پت میں بیٹھے ہوئے حالی کو اس

طرح بے قرار کر دیا کہ خود سیلاب زدہ شاید اتنے بے چین نہ ہوئے ہوں گے۔

مولانا احسن اللہ ثاقب نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ برسات میں وہ پانی پت گئے۔ اس زمانے میں دو تین روز سخت بارش ہوئی۔ مولانا حالی کی بے قراری دیکھی نہیں جاتی تھی۔ کمرے میں "مضطربانہ برابر ٹہلتے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر نہایت خضوع و خشوع سے جنابِ باری میں غرباء کے لئے جن کے مکان گر رہے تھے دعا کرتے۔"

۱۹۰۵ء میں مولانا حالی حیدر آباد گئے ہوئے تھے۔ اُس زمانے کا ایک واقعہ مولوی عبدالحق صاحب نے بیان کیا ہے۔ "ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدر آباد کے ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اُترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اُس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کر دی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور سٹاڑ سٹاڑ کئی ہنٹر اس غریب کے رسید کر دیئے۔ مولانا یہ نظارہ اُوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آئے۔ مولانا سے ملے، مزاج پُرسی کی، کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے 'ہائے ظالم کیا کیا' اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہیں کھایا۔ کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔ اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔"

لیکن ان کی ہمدردی محض لفظی نہ تھی کہ وہ دوسروں کی تکلیف دیکھ کر صرف

رنجیدہ نہ ہو جاتے تھے۔ بلکہ عملی طور پر جہاں تک ہو سکتا مصیبت زدوں کی مدد اور حاجت مندوں کی حاجت روائی بھی کیا کرتے تھے۔ آمدنی قلیل تھی اور ذمہ داریاں بہت لیکن فراخ دلی کا یہ حال تھا کہ جب کبھی کوئی ضرورت مند اُن کے پاس آیا۔ خالی ہاتھ واپس نہیں گیا۔ اُن کے ملازموں کا بیان ہے کہ ضرورت مند آتا تو چپکے سے مٹھی بند کر کے اُسے دیتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہو کہ کیا دیا۔ جن کو روپے کے بجائے کسی اور مدد کی ضرورت ہوتی اُن کی دوسری طرح مدد کرتے۔ سفارش سے کام نکال سکتے تو سفارش کرتے۔ بیمار کا علاج دوا کراتے۔ اور تیمارداری کرتے۔

لوگ مولانا حالی کی ہمدردی اور رحم دلی کو جلدی سے پہچان لیتے تھے اور غریب و پیشہ ور لوگ بھی اُن سے عجیب عجیب فرمائشیں کرتے تھے۔ ایک نائی کا یہ دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے اپنی محبوبہ کو رام کرنے کے لئے مولانا سے تعویذ مانگا تھا۔ اور مولانا نے اُس کی لوگوں سے سفارش بھی کی۔

مولانا حالی کی زندگی میں سچے ایثار کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ خود اُن کا کلام اُن کی سیرت کی اس اہم خصوصیت کی تفسیر ہے۔

سرسید کی طرح حالی کو بھی قوم نے خوب خوب قومی خدمتوں کے انعام دیئے۔ وہ سرسید کے دوست اور ساتھی ہونے کی وجہ سے ایک تو یونہی موردِ ملامت تھے۔ اور "نیچری" (جس کا مطلب اُس زمانے میں کافر، ملحد، بے دین، ملعون، مردود سب ہی کچھ تھا) کہے جاتے تھے۔ پھر انہوں نے شاعری میں ایک نئی راہ نکالی۔ حبِ وطن، برکھا رُت وغیرہ قسم کی نظمیں کہیں جو عام مذاق سے الگ تھیں (اور عوام ہر نئی چیز سے بدکتے اور چڑتے تھے) پھر مسدس حالی میں "شعر و قصائد کے ناپاک دفتر" کے پول کھولے اور یاوہ گو شاعروں کی

شان میں کہا ؎

پہ ہجرت جو کر جائیں شاعر ہمارے　　کہیں مل کے خس کم جہاں پاک سارے

ان سب باتوں کی وجہ سے انہوں نے گویا ادب و شاعری کے خود ساختہ علم برداروں سے مخالفت مول لے لی۔ اور پھر مقدمہ شعر و شاعری نے تو آگ ہی لگا دی خصوصاً لکھنؤ والے جو اُس وقت اپنی کنگھی چوٹی کی شاعری کو سرمایۂ کائنات سمجھتے تھے۔ بھڑک ہی تو اُٹھے۔ ہر طرف سے اعتراض، نکتہ چینیوں، لعن طعن کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ حالیؔ کے پاس پچاسیوں خط گالی و دشنام سے بھرے ہوئے آتے۔ اخباروں میں اُن کے خلاف مضامین لکھے جاتے۔ اودھ پنچ ان میں سب سے پیش پیش تھا۔ مدت تک اُس میں "مقدمہ" کے خلاف مضامین نکلتے رہے۔ ان مضامین میں صرف جا بے جا اعتراض ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ پھبتیوں اور پھکڑ مذاق سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ خالی۔ خیالی۔ ڈفالی نامی حریف حالیؔ سے مقابلے کے لئے میدان میں اُتارے گئے اور

ابتر ہمارے حملوں سے حالیؔ کا حال ہے　　میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

اور...　　دلّی دِلّی کیسی دلّی　　پانی پت کی بھیگی بلّی

جیسے فقروں اور شعروں کے حربے استعمال کئے گئے۔

حالیؔ سب کچھ پڑھتے، سنتے اور سہتے رہے۔ نہ خود ان لایعنی مہمل باتوں اور متعصبانہ اعتراضوں کا کوئی جواب دیا نہ کسی دوسرے کو دینے دیا۔ ایک مرتبہ خواجہ غلام الحسنین مرحوم نے اور ایک مرتبہ حالیؔ کے کسی اور دوست نے اُن سے اصرار کیا کہ ہمیں ان کا جواب لکھنے کی اجازت دیجئے مگر حالیؔ نے انہیں منع کر دیا اور کہا تو حیرت سے صرف یہ ؎

اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالیؔ پہ نچوڑ!　　شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص؟

یہی نہیں کہ صرف پھکڑ اور مسخرے اخبار اور سطحی مذاق کے لوگ حالی کے خلاف تھے بلکہ بعض معقول اخبار رسالے اور پڑھے لکھے سمجھدار لوگ بھی اُن کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ لیکن "اُن[1] میں مخالفت سہنے کا عجیب و غریب مادہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو وہ صبر کے ساتھ سہتے رہتے تھے۔ جواب دیتے تھے مگر حجت نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات نامعقول بات اور کٹ حجتی پر غصہ آتا تھا۔ مگر ضبط سے کام لیتے تھے"

مولانا حسرت موہانی نے ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے "اردوِ معلےٰ" جاری کیا اور مولانا حالی پر اعتراضات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چھیڑ دیا۔ حالی کے پاس رسالہ باقاعدہ آتا تھا اور وہ اُسے پڑھتے تھے مگر کبھی جواب نہیں دیا۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی نے یوں بیان کیا ہے۔

"علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کے لئے تشریف لائے اور حسبِ معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرت موہانی دو دوستوں کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے میں سے حسرت کو دیکھا۔ اُن میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانے میں گئے اور اُردوِ معلےٰ کے دو تین پرچے اُٹھا لائے۔ حسرت اور اُن کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں۔ اور اُٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچے کے ورق اُلٹنا شروع کئے اور مولانا حالی کو مخاطب کر کے حسرت

---

[1] چند ہم عصر

اور اُردوِ معلّیٰ کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے..... کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور واہ وا خوب لکھا ہے کہہ کر داد دیتے..... حالی بھی ہوں ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے......

اتنے میں سیّد صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کرکے بولے ارے مولانا یہ دیکھئے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے۔ اور کچھ اس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کئے: "سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخربِ زبان کوئی ہو نہیں سکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اُردو کی خدمت سے روک لیں اُتنا ہی اچھا ہے۔ فرشتہ منش حالی ذرا مکدّر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرتؔ سے پوچھا اب بھی حالی کے خلاف کچھ لکھو گے؟ جواب دیا جو کچھ لکھ چکا اُسی کا ملال اب تک دل پر ہے"

لعن وطعن، گالی ودشنام، طنز واعتراضات کے اس طوفان کو حالی نے ایک نرالے طریقے سے زیر کیا ؂

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چُپ　　　سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے مخالفت کا یہ طوفان جو خس وخاشاک کی کائنات تھا، جلدی ہی دب گیا اور حالی کی عظمت اور شان اپنی جگہ پر قائم رہی:۔

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

چالیس سال کی عمر میں حالی کی ملاقات سر سیّد سے ہوئی تھی اور اُن کی شخصیت اور تحریک کا دل پر بڑا گہرا اثر پڑا تھا۔ اب اُنہیں گویا وہ رہنما مل گیا. جسے اُن کا دل چالیس سال سے تلاش کر رہا تھا۔ اُس دن سے مرتے دم

تک تقریباً چالیس ہی سال حالیؔ کا تعلق علی گڑھ سے رہا۔ وہ سرسید کے کاموں میں اُن کے شریک، مشیر اور ساتھی رہے۔ زبان سے، قلم سے، ہاتھ پاؤں سے ہر طرح علی گڑھ کی تحریک کی خدمت کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے خاندان کے، دوستوں کے اور غیروں کے بیسیوں لڑکوں کو وہاں تعلیم پانے کے لئے بھیجا۔ چندے جمع کرکے علی گڑھ کالج کی مدد کی۔ جلسوں میں انتہائی پر اثر نظمیں پڑھ کر لوگوں کے جذباتِ قومی کو اُبھارا، سرسیّد کے ساتھ کالج کے مفاد کی خاطر بہت سے سفر کئے اور ہر طرح سے علی گڑھ کالج کی خدمت کرتے رہے۔ وہ کالج کے ٹرسٹی بھی تھے۔ اس عرصے میں متعدد بار کالج میں اختلافات اور تنازعات ہوئے لیکن انہوں نے ہمیشہ ٹرسٹی کے فرائض پوری ایمان داری اور صداقت کے ساتھ انجام دیئے۔ ان کے دل میں سرسیّد کا بے حد احترام اور بڑی محبت تھی۔ لیکن حق کی محبت اس سے بھی زیادہ تھی۔ جب ۱۹۰۷ء میں یورپین اسٹاف کالج پر حاوی ہونے لگا تو وقار الملک اور محسن الملک وغیرہ کی طرح حالیؔ نے بھی اِسے کالج کے مفاد کے خلاف سمجھا اور اُس کا زور توڑنے میں سرسیّد کی مخالف جماعت کا ساتھ دیا۔ سیّد محمود سے بھی حالیؔ کی پرانی دوستی اور تعلقات تھے۔ وہ سیّد محمود جن کا سر کسی بڑے سے بڑے آدمی کے آگے نہیں جھکا، حالیؔ کا بے حد احترام کرتے تھے جس کا اندازہ ان کے اس قول سے ہوتا ہے جسے سر راس مسعود نے بیان کیا ہے "ابا جانی! اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے گا کہ میرے چنے بندوں سے تو ملا ہے اُن میں سے کون ایسا ہے جس کی پرستش کرنے کے لئے تیرا دل تیار ہو جائے تو میرے پاس جواب حاضر ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالیؔ ہے" جب سرسیّد کی جانشینی کے لئے سیّد محمود کا انتخاب کیا گیا تو حالیؔ اُن کے ہم خیال تھے۔ لیکن چند سال کے اندر انہیں اندازہ ہو گیا کہ سیّد محمود

کا رہنا کالج کے لئے فائدہ مند نہیں تو انہوں نے باوجود ذاتی مراسم کے اُن کے کالج کی سیکریٹری شپ سے الگ کرانے کی پوری کوشش کی۔

اُن کی آرزو تھی کہ سب ٹرسٹی اسی خلوص اور ایمان داری سے کالج کے مفاد کو پیشِ نظر رکھیں۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں طلبا کی شورش کے تحقیقاتی کمیشن کے صدر کو انہوں نے مشورہ دیا کہ نکمّے اور نالائق ٹرسٹیوں کی بھرتی (جو غالباً پیسے کے بل پر منتخب ہو جاتے تھے) جو سرسیّد کے زمانے سے ہو رہی ہے اور ابھی تک وہی اصول چلا آرہا ہے اُسے بند کرنا چاہیئے اور ایسی تدبیر کرنی چاہیئے جس سے موجودہ ٹرسٹیوں کی غفلت اور بے پروائی دور ہو اور کسی عمدہ مستحکم اصول سے اُن کا انتخاب عمل میں آیا کرے۔ حالؔی کی اس رائے پر اگر عمل درآمد کیا جاتا تو علی گڑھ یونیورسٹی کی تاریخ میں وہ تاریک سال نہ آئے ہوتے جن کی بدولت اس کی گذشتہ نیک نامی پر حرف آیا۔ حالؔی کالج کو چند اُمراء یا حکام کی ذاتی ملکیت بنا دینے کے مخالف تھے اور اُسے قوم کی امانت سمجھتے تھے۔

ایک مرتبہ نواب وقارالملک مرحوم اور مسٹر آرچبولڈ کا سیکریٹری اور پرنسپل کے اختیارات کے بارے میں بہت دن تک جھگڑا چلا۔ حالؔی جانتے تھے کہ مسٹر آرچبولڈ کو خوش کرنے کی خاطر سارے اہلِ غرض یعنی زمیندار، تعلقدار اور سرکاری نوکر وغیرہ اُن کے ہم رائے ہو جائیں گے اور اس سے کالج کو مالی نقصان پہنچے گا۔ لیکن قومی عزت اور کالج کا مستقبل اُن کے لئے زیادہ اہمیت رکھتا تھا پہلی چیز نقصان دہ ہے لیکن دوسری چیز مہلک ہے۔ خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں "پہلا اندیشہ دوسرے سے میرے نزدیک زیادہ سخت ہے کیونکہ ہز آنر کے وہ مشورے مان لئے گئے جن کے قبول کرنے سے عذر کیا گیا ہے تو سیکریٹری بلکہ ٹرسٹیوں کا عدم اور وجود برابر ہو جائے گا۔ اور محمڈن کالج بمنزلہ گورنمنٹ کالج کے ہو جائے گا۔"

مولانا حالی ہی سرسید کے معتقد نہیں تھے بلکہ سرسید بھی حالی کا بے حد احترام کرتے تھے اور اُن کی عظمت کے قائل تھے۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا "ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور فخر کرنا چاہیئے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا۔ آئندہ زمانے میں جب کہا جاوے گا کہ فخرِ قوم، فخرِ شعراء، فخرِ علماء اور زندہ کرنے والا، اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور اُن سے نجات دِلانے والا قوم کا کون ہے تو کہا جاوے گا کہ حالی"۔

بہ خلاف دوسرے رہنماؤں کے حالی نے صرف مردوں ہی کی تعلیم کو ضروری نہیں سمجھا بلکہ اُس زمانے میں جب عورتوں کو تعلیم دلانا عیب اور گناہ سمجھا جاتا تھا، انہوں نے اُن کے حقوق کے اور اُن کی تعلیم کے حق میں آواز بلند کی۔ حالی شاعر اور ادیب تھے۔ اُن کا کام قلم کے ذریعے اور شعر کی شکل میں اپنے خیالات لوگوں تک پہنچانا تھا اور انہوں نے اس کام کو بڑی خوبی سے اور بڑے اثر آفریں انداز میں انجام دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بس بھر عملی طور پر بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ چنانچہ انہوں نے خود اپنے خاندان کی عورتوں کو پڑھنے لکھنے کی طرف توجہ دلائی۔ لکھنا اُس وقت عورت کے لئے سخت عیب کی بات سمجھی جاتی تھی۔ میری والدہ سنایا کرتی تھیں کہ بچپن میں انہیں پڑھنا تو آگیا تھا لیکن لکھنا سیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ اور چونکہ اُن کے والد اپنی ملازمت پر رہتے تھے اور دادا دوسرے گھر میں۔ اسی لئے گھر میں قلم دوات وغیرہ بھی نہ تھا۔ دوپہر کو جب دادی سو جاتیں تو وہ توے کی سیاہی گھول کر اور سرکنڈے کا قلم بنا کر چھپ چھپ کر کسی کتاب کی عبارت نقل کرتیں۔ اور اس طرح انہوں نے لکھنا سیکھا۔ ایک مرتبہ اُن کی دادی نے دیکھ لیا۔ اور انھیں منع کیا اور مولانا حالی سے شکایت کی۔ وہ پوتی کا یہ شوق دیکھ کر بہت خوش ہوئے انہیں قلم، دوات، قلم دان اور تختی وغیرہ منگا کر دی اور اُن کی دادی کو

سمجھا یا کہ عورتوں کے لئے لکھنا معیوب نہیں بلکہ ایک مفید ہنر ہے۔

ایک خط میں خواجہ سجاد حسین کو اُن کی چھوٹی بچی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مسرورہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا کارڈ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ جب کبھی خط یا کارڈ یا مشق کے طور کچھ لکھیں پنسل سے کاغذ پر خط کھینچ دینے چاہئیں تاکہ ان کو سیدھی سطر لکھنے کی عادت ہو۔ اس زمانے میں خوش نویسی اسی کا نام ہے کہ سطر بندی اور رُخ اور کرسی درست ہو۔ لکھتے لکھتے خط خود بخود ایک صورت پکڑ لے گا۔ کبھی کبھی حساب کے سوالات بھی اُن سے کرانے چاہئیں اور دونوں (بہنوں) کے پاس سلیٹ اور پنسل ہونی چاہیئے"

۱۸۹۴ء کے لگ بھگ انہوں نے پانی پت میں اپنے گھر سے ملے ہوئے ایک مکان میں لڑکیوں کا ایک چھوٹا سا اسکول بھی کھولا تھا۔ یہ اسکول چوتھی جماعت تک کا تھا اور اُن کے عزیزوں اور دوستوں کی لڑکیاں اُس میں پڑھتی تھیں۔ انہیں اسکول کی ترقی کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے آرام کا بھی بڑا خیال رہتا تھا۔ چنانچہ ایک خط میں لکھا ہے "لڑکیوں کے مدرسے کے لئے ایک پنکھا تیار ہونا چاہیئے اور ایک لڑکا پنکھا کھینچنے کے لئے نوکر رکھنا چاہیئے ورنہ برسات کا موسم اُس تنگ مکان میں مشکل سے کٹے گا اور اگر ممکن ہو تو چھ سات بجے سے بارہ یا گیارہ بجے تک کا وقت بہت مناسب ہے کیونکہ بڑی لڑکیاں جو گھر کا کاروبار کرتی ہیں اُن کا بڑا حرج ہوتا ہے"

اس اسکول میں دلّی کی ایک استانی پڑھاتی تھیں۔ اُس زمانے میں اچھی استانی تلاش کرنا بے حد مشکل تھا۔ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جاننے والی عورت مل جائے وہی غنیمت معلوم ہوتی تھی۔ خدا جانے کتنی تلاش کے بعد یہ اُستانی دستیاب ہوئی تھیں۔ ۱۸۹۵ء میں مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی نے اُن سے درخواست کی کہ ایک استانی کہیں سے بھیجیے۔ انہیں جواب میں لکھتے ہیں "پانی پت میں لے

دے کر ایک دلی کی رہنے والی معلمہ ہے۔ سجاد حسین نے پانی پت میں ایک مدرسۂ نسواں قائم کر کے اس معلمہ کو بمشاہرہ دس روپے ماہوار اُس میں نوکر رکھا تھا۔ آٹھ دس مہینے میں شاگردیں استانی کے برابر ہو گئیں بلکہ بعضی اُس سے بھی بڑھ گئیں... یہ حال اُس کی استعداد کا ہے....'' غالباً کسی مناسب استانی نہ مل سکنے کے سبب چند سال بعد یہ اسکول بند ہو گیا تھا۔

اپنی کئی نظموں میں حالی نے عورتوں کے حقوق کی حمایت کی ہے۔

''چُپ کی داد'' میں کہتے ہیں ؎

افسوس دنیا میں بہت تم پر ہوئے جور و جفا
حق تلفیاں تم نے سہیں بے مہریاں جھیلیں سدا

اور

جو علم مردوں کے لئے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھیرا تمہارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سر بسر
آیا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں
ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پا کر آدمی بننا تمہیں زیبا نہیں

بیوہ عورتوں کے ساتھ بدسلوکی اور مظالم اور عقدِ ثانی نہ کرنے کی رسم کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے انہوں نے بیوہ کے جذبات کی ترجمانی جس دل گداز انداز میں کی ہے وہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔

ایک دوسری جگہ لڑکیوں کی شادی کے بارے میں لکھا ہے ؎

جاہلیت کے زمانے میں یہ تھی رسمِ عرب
کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگ دل باپ اُسے گود سے لے کر ماں کی
گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جا کر

رسم اب بھی یہی دنیا میں ہے جاری لیکن
جو کہ اندھے ہیں ہیئے کی نہیں کچھ اُن کو خبر

لوگ بیٹی کے لیئے ڈھونڈتے ہیں جب پیوند
سب سے اوّل اُنہیں ہوتا ہے یہ منظورِ نظر

ایسے گھر بیاہیئے بیٹی کو جو ہو آسودہ
اور مہ و مہر سے جو ذات میں ہو افضل تر

چھان بین اس کی تو کرتے ہیں گھر کیسا ہو؟
پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بَر

بدمزاجی ہو، جہالت ہو کہ ہو بَدچلنی
کچھ برائی نہیں ذی تو نتا ہے داماد اگر

یہ وہی ناشدنی ریت ہے جس کے کارن
بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر

اپنا اور بیٹیوں کا جب کہ نہ سوچیں انجام
جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بَدتر

عورتوں کی تعلیم اور بچوّں کی پرورش اور تربیت کے اصولوں پر مولانا حالؔی نے ایک کتاب قصے کے پیرائے میں مجالس النساء کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں تعلیم و تربیت کے اصول نہایت سادہ، دلنشین اور دلچسپ انداز میں بتائے گئے ہیں۔ اس کتاب پر پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیم نے چارسو روپے کا انعام محکمۂ تعلیم کی طرف سے دیا تھا اور سالہا سال تک یہ پنجاب کے لڑکیوں کے نصاب میں داخل رہی۔ چند سال پہلے تک عورتیں اور لڑکیاں اِسے بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھتی تھیں۔

مولانا حالؔی کی سیرت کی ایک اور اہم خصوصیت اُن کی بے تعصّبی ہے۔ وہ ہر قوم اور ہر فرقے کے لوگوں سے ایک سی محبّت اور سلوک سے پیش آتے تھے۔ اُس زمانے میں مسلمانوں میں انگریزوں سے بہت تعصب اور چھوت چھات برتی جاتی تھی لیکن مولانا کے بعض انگریزوں سے بھی بہت خوشگوار تعلقات تھے اور ہندوؤں میں تو ان کے بیسیوں دوست تھے۔ محبت میں، ہمدردی میں، سفارش میں سلوک میں کبھی انھوں نے یہ امتیاز نہیں کیا کہ یہ شخص مسلمان ہے یا ہندو۔

اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ ایسی ہی محبت اور خلوص کا سلوک کرتے تھے جس طرح مسلمانوں کے ساتھ۔

اپنے بیٹے کو ایک صاحب کی سفارش کرکے لکھتے ہیں "وہ ہمارے شفیق دوست لالہ تلسی رام صاحب ساہوکار کے نہایت قریب کے رشتے دار ہیں۔ امید ہے کہ عنقریب معائنے کے موقع پر وہ تم سے ملیں گے۔ چونکہ تم اُن سے واقف نہ تھے اس لئے تلسی رام صاحب کی یہ خواہش تھی کہ لالہ بنارسی داس کے حال سے تم کو مطلع کردیا جائے تاکہ تم ان سے عزیز ہموطنوں کی طرح ملو ....."

لالہ چندو لال کو اُن کے والد کی وفات پر تعزیت کے خط میں لکھا ہے۔

"عزیزی و شفیقی سلمہ اللہ۔ آپ کی تحریر سے میرے دلی دوست بہاری لال مشتاق کی وفات کا حال معلوم ہوا۔ جس کا صدمہ کبھی دل سے فراموش نہیں ہو سکتا۔ میرے دہلوی دوستوں میں سے افسوس ہے کہ ایک خالص اور مخلص دوست کم ہوگیا جس کا بدل ملنا مشکل ہے۔ ایسے وضعدار، محبت کے پتلے، حاضر و غائب یکساں اور اپنے اسکول کے فدائی کم ہوتے ہیں۔"

وہ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے خواہاں تھے اور جو لوگ آپس میں مخالفت اور منافرت پھیلانا چاہتے انہیں ملک و قوم کا سخت دشمن سمجھتے تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔

"جو لوگ ہندو مسلمانوں میں تفرقہ اور پھوٹ ڈالنے والی کتابیں لکھتے ہیں وہ ہندوستان کے سخت دشمن ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، برہمو ہوں یا آریا۔"

رسالہ اتحاد لکھنؤ کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"درحقیقت اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا کہ ہندو مسلمانوں میں دوستی اور یک جہتی کے روابط مستحکم نہیں ہو سکے۔ بے شک بدقسمتی سے ایسے چند ناشدنی اسباب پیدا ہوگئے ہیں جن سے بالفعل دونوں قوموں کی ایک محدود جماعت

کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے...... بغیر اتفاق اور یک جہتی کے دونوں قوموں کا ملک میں عزت سے رہنا اور گورنمنٹ کی نظر میں عزت و توقیر پیدا کرنا غیر ممکن ہے"

برادرانِ وطن کے کارناموں کی تعریف کس کشادہ دلی سے کرتے ہیں:-

یہاں اور ہیں جتنی قومیں گرامی خود اقبال ہے آج اُن کا سلامی
تجارت میں ممتاز دولت میں نامی زمانے کی ساتھی ترقی کے حامی
نہ فارغ ہیں اولاد کی تربیت سے
نہ بے فکر ہیں قوم کی تقویت سے

معزز ہیں ہر ایک دربار میں وہ گرامی ہیں ہر ایک سرکار میں وہ
نہ رسوا ہیں عادات و اطوار میں وہ نہ بدنام گفتار و کردار میں وہ
نہ پیشے سے حرفت سے انکار اُن کو
نہ محنت مشقت سے کچھ عار اُن کو

اور تعصب کو حالی کس نظر سے دیکھتے تھے؟

تعصب کہ ہے دشمنِ نوعِ انساں بھرے گھر کئے سینکڑوں جس نے ویراں
ہوئی بزمِ نمرود جس سے پریشاں کیا جس نے فرعون کو نذرِ طوفاں
گیا جوش میں بولہب جس کے کھویا
ابوجہل کا جس نے بیڑا ڈبویا

کبھی کتابِ ہدیٰ کا یہ سبق سُناتے ہیں:-

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دُنیا میں انساں کے انساں

اور حالی کا مسلک عمر بھر یہی رہا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "میں تو فرائض کے بعد کوئی عبادت اور کوئی بھلائی اس کے برابر نہیں سمجھتا کہ اولاً اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ اور پھر تمام ابنائے جنس کے ساتھ جہاں تک ہوسکے سلوک اور بھلائی کی جائے"

اتحاد کی برکت سنیئے!

ملک ہیں اتحاد سے آزاد شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا گر کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر

اردو ہندی کا قصہ مولانا حالی کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ حالی اردو کے ادیب، اُردو کے شاعر، اردو کے خادم تھے۔ لیکن جیسے وہ اور ہر قسم کے تعصب سے پاک تھے ویسے ہی لسانی تعصب سے بھی کوسوں دور تھے۔ مخزانۂ جاوید کے تبصرے میں لکھا ہے۔

"آج کل اہلِ ملک کی بدقسمتی سے جو اختلافات ہندو مسلمانوں میں اردو زبان کی مخالفت یا اُس کی حمایت کی وجہ سے برپا ہے اُس کی رفع داد اگر ہوسکتی ہے تو اس طریقے سے ہوسکتی ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ اصحاب کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اردو زبان میں جو درحقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اُس کی ایک پروان چڑھی ہوئی اولاد ہے، اس طرح تصنیف و تالیف کریں جس طرح ہمارے ہر دلعزیز ہیرو (لالہ سری رام صاحب) نے اس طولانی تذکرے کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور مسلمان مصنفین بے ضرورت اردو میں عربی، فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہوسکے پرہیز کریں اور اُن کی جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اردو کو مالا مال کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی بنیاد ڈالیں اور ایک

متنازعہ فیہ زبان کو مقبولۂ فریقین بنائیں ...... مذکورۂ بالا اختلافات کے متعلق جو تعصب اور ناگواری کا الزام ہندوؤں پر لگایا جاتا ہے اس قسم کا بلکہ اس سے زیادہ سخت الزام مسلمانوں پر لگایا جاسکتا ہے. کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار برس سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اس طویل مدت میں انہوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا ..... اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو بمقابلے سنسکرت کے نہایت سہل الحصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف، شگفتہ اور فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے، اس کو بھی عموماً بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے حالانکہ جو اردو اُن کو اس قدر عزیز ہے اس کی گریمر کا دار و مدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر پر ہے۔ عربی فارسی سے اُس کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں کے اسماء اس میں کثرت سے شامل ہو گئے ہیں۔ باقی تمام اجزائے کلام جن کے بغیر کسی زبان کی نظم و نثر مفید معنی نہیں ہو سکتی برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم برج بھاشا سے بے پروا یا متنفر ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثل کا مصداق بنانا ہے کہ دریا میں رہنا اور مگرمچھ سے بیر ......"

ایسی سچّی اور کھری باتیں وہی کہہ سکتا ہے جسے تعصب اور ناانصافی چھو بھی نہ گئی ہو اور جس کے خمیر میں انصاف اور رواداری بسی ہوئی ہو۔ یہ باتیں اکثر لوگوں کو ناگوار گزریں اور انہوں نے اس کی مخالفت کی مگر حالی نے ہمیشہ سچ کی تلخی کو برداشت کیا تھا۔ اس معاملے میں سچّی بات کہنے سے کیوں دریغ کرتے؟

مقدمہ شعروشاعری میں بھی انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اردو کے ادیب اور محقق کو سنسکرت یا کم سے کم ہندی بھاشا ضرور جاننا چاہیے۔ "اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لئے صرف دِلّی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دست گاہ بہم پہنچائی جائے۔ اردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے۔ اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصّہ اسماء کا ہندی سے ماخوذ ہے........ پس اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا مطلق نہیں جانتا اور محض عربی فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے۔ وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیئوں کے منزلِ مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے اور جو عربی فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسہ پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے ایک ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔....."

حاؔلی کا خیال تھا کہ ہندی کے آسان اور شیریں الفاظ زیادہ سے زیادہ اردو میں داخل کرنے چاہئیں اس سے زبان کو وسعت اور لوُچ دونوں حاصل ہوں گے۔ انہوں نے خود اپنی نثر اور نظم میں بڑی خوبی کے ساتھ سینکڑوں ہندی الفاظ بے تکلّف استعمال کئے ہیں۔ اگر حاؔلی کے مشورے پر عمل کیا جاتا اور اُن کی تقلید اردو زبان کے حامی کرتے تو شاید ہندی اُردو کا جھگڑا اتنا نہ بڑھنے پاتا۔ اگر مسلمان ہندی سے وہ بے اعتنائی (جو حاؔلی کے زمانے میں کم اور بعد میں بہت زیادہ برتی گئی) نہ برتتے تو آج اُردو کو ہندوستان میں یہ روزِ بد نہ دیکھنا نصیب ہوتا۔ اُردو سے جو تعصّب آج پھیلا ہوا ہے اُس میں بیچاری اُردو کا کوئی قصور نہیں۔ وہ سینکڑوں برس سے سب اہلِ وطن کے دلوں میں گھر کر چکی تھی اور اب بھی کروڑوں کے دل میں اس کی محبّت موجود ہے۔ اس مخالفت کی ذمہ داری ایک حد تک اُس

کے اُن نادان دوستوں پر ہے جنہوں نے اُس کی حمایت کا ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے اُسے نقصان ہی نقصان پہنچا۔ یا اُن سیاسی حالات کی بدولت اُسے یہ دشمنی سہنی پڑ رہی ہے۔ جنہوں نے ملک کو تقسیم کرا کے تہذیب 'تمدّن' زبان سب کو تقسیم کرانے کی بنا ڈالی۔

سودیشی کی تحریک مولانا حالیؔ کے سامنے شروع ہو چکی تھی اور وہ اس کے بڑے حامی تھے اور اُسے ملک و قوم کے لئے بہت فائدہ مند سمجھتے تھے۔ خواجہ سجاد حسین نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ والد مرحوم سودیشی کپڑا بڑے شوق سے پہنتے تھے اور پانی پت کے جُلاہوں کا بُنا ہوا کپڑا دوستوں کو تحفے کے طور پر بھیجا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اعلےٰ درجے کی گبرون کا تھان جو پانی پت کے جُولاہوں نے بُنا تھا انہوں نے سرسیّد کو تحفے میں بھیجا جس کا انہوں نے سوٹ سلوایا۔ اور شام کے وقت جب عمارتوں کے معائنے کے لئے آتے تو اکثر اِس سوٹ کو پہنا کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں منشی دیا نرائن نگم (ایڈیٹر زمانہ) نے مسلمان مشاہیرِ ہند سے سودیشی کی تحریک کے بارے میں یہ تین سوال پوچھے تھے۔

(۱) سودیشی تحریک بذاتِ خود ملک کی ترقی کے لئے کہاں تک مفید ہے۔ اس کے نشیب و فراز نفع نقصان اور عمل درآمد کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

(۲) سودیشی تحریک میں ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی کہاں تک ضرورت ہے۔ خاص مسلمانوں کے لئے اس سے کہاں تک نفع یا نقصان پہنچنے کی امید ہے؟

(۳) اس کی کامیابی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور اس کی کامیابی کا

ہندو مسلمانوں پر جداگانہ اور ملک پر بحیثیتِ مجموعی کیا اثر ہوگا؟

مولانا حالی نے ان سوالات کا جواب مُفصّل مضمون کی شکل میں بھیجا تھا جو زمانہ کے اپریل سنہ ۱۹۰۶ء کے پرچے میں شائع ہوا تھا۔ اُن کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ جس قدر تحریکیں اب تک ہندوستان کی بھلائی کے لئے دیسیوں کی طرف سے ہوئی ہیں میرے نزدیک ان میں سے کوئی ایسی تحریک جس سے ملک کو حقیقی فائدہ پہنچنے کی اُمید ہو سودیشی تحریک سے بہتر نہیں ہوئی۔ دوسرے سوال کے جواب میں لکھا کہ ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی نہ صرف سودیشی تحریک میں بلکہ ہر کام میں جو ہندوستان کی عام بھلائی سے تعلق رکھتا ہو اشد ضرورت ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں سودیشی تحریک جیسی ہندوؤں کے حق میں مفید ہے ویسی ہی مسلمانوں کے حق میں مفید ہے .... اس تحریک کا اثر ملک پر ضرور ہوگا اور رفتہ رفتہ کم و بیش ہوتا رہے گا۔ لوگوں کو اُس سرنگ کا راستہ معلوم ہو گیا ہے جس راستے سے ملک کی دولت غیر ملکوں کو کھنچی چلی جاتی ہے۔ مگر اس راستے کو بند کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اگر ایک صدی میں بھی ہندوستان غیر ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو سمجھو اُس کو بہت جلد کامیابی ہوگئی۔

مسدس میں کئی جگہ ان خیالات کا عکس نظر آتا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اگر اک پہننے کو ٹوپی بنائیں   تو کپڑا وہ اک اور دنیا سے لائیں
جو سینے کو وہ ایک سوئی منگائیں   تو مشرق سے مغرب کو لینے کو جائیں
ہر اک شے میں غیروں کے محتاج ہیں وہ
مکینکس کی رو میں تاراج ہیں وہ
نہ پاس اُن کے چادر نہ بستر ہے گھر کا   نہ برتن ہیں گھر کے نہ زیور ہے گھر کا

نہ چاقو، نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا   صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا
کنول مجلسوں میں، قلم دفتروں میں
اثاثہ ہے سب عاریت کا گھروں میں
جو مغرب سے آئے نہ مالِ تجارت   تو مر جائیں بھوکے وہاں اہلِ حرفت
ہو تجّار پر بند راہِ معیشت   دکانوں میں ڈھونڈی نہ پائے بضاعت
پرائے سہارے ہیں بیوپار واں سب
طفیلی ہیں سیٹھ اور تجّار واں سب

حالیؔ کہنے کو ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن یہ زمینداری یو۔پی اور بہار کے رئیسوں کی زمینداری نہ تھی بلکہ پنجاب کے بٹوارے کے اصولوں پر زمین والے اپنی زمین بٹائی پر (آدھا آدھا حصہ) کسان کو دیا کرتے تھے اور نفع نقصان میں دونوں برابر کے شریک ہوتے تھے اور اس چھوٹے سے زمیندار خاندان کے افراد کو اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے لئے ہمیشہ محنت مشقّت کرنی پڑتی تھی۔ حالیؔ نے آنکھ کھول کر دیکھا تو غربت کو ساتھی اور صرف محنت اور کوشش کو مددگار پایا اور وہ اپنے خاندان کے دوسرے بوڑھوں اور جوانوں کی طرح زندگی بھر محنت اور کام کرتے رہے۔ لیکن اُن سے زیادہ خوش دلی اور لگن سے۔ وہ محنت کو عزّت اور کام کو انسان کی عظمت کا سبب سمجھتے تھے۔ وہ خود "مزدور" تھے اور محنت کرنے والوں کی اور اُن کے کام کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس کی تعریف خود حالیؔ کی زبانی سنیئے۔ نکمّوں اور مفت خوروں کے ذکر کے بعد کہتے ہیں ؎

مگر اک فریق اور ان کے سوا ہے   شرف جس سے نوعِ بشر کو ملا ہے
سب اس بزم میں جن کا نور و ضیا ہے   سب اس باغ کی جن سے نشو و نما ہے

ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر
بنے ہیں زمانے کی خدمت کی خاطر

نہ راحت طلب ہیں نہ مہلت طلب وہ
لگے رہتے ہیں کام میں روز و شب وہ
نہیں لیتے دم ایک دم بے سبب وہ
بہت جاگ لیتے ہیں سوتے ہیں تب وہ
وہ تھکتے ہیں اور چین پاتی ہے دنیا
کماتے ہیں وہ اور کھاتی ہے دنیا

چُنیں گر نہ وہ ہوں کھنڈر کاخ و ایواں
بُنیں گر نہ وہ شاہ و کشور ہو عریاں
جو بوئیں نہ وہ، تو ہوں جاندار بے جاں
جو چھانٹیں نہ وہ تو ہوں جنگل گلستاں
یہ چلتی ہے گاڑی اُنہیں کے سہارے
جو وہ کل سے بیٹھیں تو بے کل ہوں سارے

کھپاتے ہیں کوشش میں تاب و تواں کو
گھلاتے ہیں محنت میں جسم اور جاں کو
سمجھتے نہیں اس میں جان اپنی جاں کو
وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو
بس اس طرح جینا عبادت ہے اُن کی
اور اس دھن میں مرنا شہادت ہے ان کی

زمیں سب خدا کی ہے گلزار انہیں سے
زمانے کا ہے گرم بازار انہیں سے
ملے ہیں سعادت کے آثار انہیں سے
کھُلے ہیں خدائی کے اسرار انہیں سے
انہیں پر ہے کچھ فخر گر ہے کسی کو
انہیں سے ہے گر ہے شرف آدمی کو

ہر اک ملک میں خیر و برکت ہے ان سے
ہر اک قوم کی شان و شوکت ہے ان سے
نجابت ہے ان سے، شرافت ہے ان سے
شرف ان سے، فخر ان سے، عزت ہے ان سے
جفاکش بنو گر ہو عزت کے خواہاں
کہ عزت کا ہے بھید ذلت میں پنہاں

حالیؔ نے جس طرح کام اور محنت کی اور محنتی اور مزدور کی تعریف کی ہے اور جس عزت اور اہمیت کا مقام اُسے بخشا ہے وہ بڑی بڑی تعریفوں اور لمبے چوڑے مضامین اور کتابوں پر بھاری ہے۔ حالیؔ کسی کے دشمن نہ تھے۔ نہ سرمایہ دار کے نہ زمیندار کے۔ نفرت اور دشمنی ان کی فطرت کے خمیر ہی میں نہ تھی۔ لیکن وہ کاہلوں، نکموں اور مفت خوروں کو انسانیت کے دامن پر ایک داغ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک صرف وہی انسان عزت و شرف کا مستحق اور حکومت و جہاں بانی کا اہل ہے جو خود اپنی محنت پر بھروسہ کرتا اور محنت کی "ذلت" گوارا کرتا ہے۔ اس میں وہ کسی کی تخصیص نہیں کرتے۔ محنتی آدمی خواہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو اُن کے لیے قابلِ احترام ہے۔ ان کے دل میں ہر طبقے کے اشخاص کی اصلاح کا جذبہ تھا۔ نکمے کاہل، بے حس اور مفت خوروں کے بھی وہ دشمن نہ تھے۔ وہ ان گمراہوں کا خون بہانے کے بجائے اُن کو سیدھے راستے پر ڈالنا اور اُن کی بے حسی کو دور کرنا چاہتے تھے۔ وہ انہیں نفسی مریض سمجھتے تھے جن کے علاج کی ضرورت ہے۔ مجرم نہیں جن کو سزا کی ضرورت ہو۔ شاید اسی وجہ سے باوجود ملک و ملت کی تباہ حالت کا اس قدر غور سے مطالعہ کرنے کے انہیں انسانیت پر بھروسہ، مسلمانوں کے مستقبل پر ایمان اور اہلِ وطن سے محبت اور اُمید ہے۔

حالیؔ کے ذہن میں وطن کا مفہوم کیا تھا؟ اس موضوع پر ڈاکٹر ذاکر حسین کا ایک خطبہ۔ "حالیؔ بحیثیت ایک محبِ وطن کے" مطالعے کے قابل ہے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں" اور حالیؔ کا وطن کیا تھا؟ پہلے تو حالیؔ کا وطن ان کا گھر اور کنبہ اور پانی پت تھا۔ جس کے ساتھ ان کی شیفتگی کا حال پانی پت میں کیا سنا دوں؟ یہ محبت ایسی تھی کہ دلیؔ کی محبت بھی اُن سے پانی پت نہ چھڑا سکی۔ اُس کے بعد حالیؔ کا وطن بڑھ کر دلیؔ ہوا جس کا ذکر جہاں کرتے ہیں اس طرح کہ سخت سے سخت دل پسیج

جائے........ مگر سلطنتوں کی ٹکر، حکومت کی تبدیلی، تمدنوں کے تصادم نے اس وطن کے تصوّر کو وسیع کیا اور اب ہندوستان اُس کا وطن ہو گیا۔ اُس کے کوہ وصحرا، آسمان و زمین اُس کی دل لگی کی شکلیں بنیں وہ اُس کے عنادل کے نغمے سحری اور اُس کی تاروں بھری رات کو یاد کرتا اور اُس خاک کو پاک جانتا........"

یوں حالی کے وطن کا نظریہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اب اُن کا ملک اُن کا وطن بن گیا تھا۔ اور اُس کی محبت اُن کے دل میں گھر کر چکی تھی ؎

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

لیکن وہ محض وطن کی خاک کی محبت اور در و دیوار کی اُلفت پر قانع نہ ہو سکے۔ جسے خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہو وہ کیسے اس پر بس کر سکتا تھا؟ چنانچہ انہوں نے خود ہی اپنے کو ہوشیار کیا ؎

اے دل! اے بندۂ وطن ہوشیار
خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار

نام ہے کیا اسی کا حُبِ وطن؟
جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن

کیا وطن کی یہی محبت ہے؟
یہ بھی الفت میں کوئی اُلفت ہے؟

اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند
اس سے خالی نہیں چرند و پرند

ٹکڑے ہوتے ہیں سنگِ فرقت میں
سوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں

اب وطن کی محبت کے صحیح مفہوم کو حالی پا گئے! وطن کی محبت صرف اینٹ پتھّر اور مٹّی کی محبت نہیں...... ایسا ہو تو انسان اور حیوان میں فرق ہی کیا رہا۔ وطن کی محبت عبارت ہے اہلِ وطن کی محبت سے! جس کا مطلب ہے ان کی اصلاح اور بہبود کی کوشش۔ ان کو اخلاقی پستی سے ابھارنا، ان کو دنیا میں عزت سے رہنے کے گر سکھانا اور ان کی معاشرتی حالت کو بہتر بنانا۔

وہ ایسے سچے محبِ وطن کی تلاش میں ہیں ؎

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد　　نوعِ انساں کا جس کو سمجھیں فرد
جس پہ اطلاقِ آدمی ہو صحیح　　جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے　　قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو　　قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

پھر اہلِ وطن کو مخاطب کرتے ہیں ؎

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو　　اٹھو، اہلِ وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ　　ورنہ کھاؤ پیو، چلے جاؤ
جب کبھی زندگی کا لطف اٹھاؤ　　دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار　　زندگی سے ہے جن کا دل بیزار
مقبلو، مدبروں کو یاد کرو　　خوش دلو! غم زدوں کو یاد کرو
جاگنے والے غافلوں کو جگاؤ　　تیرنے والوں ڈوبتوں کو بچاؤ

حُبِ وطن کے اسی مفہوم کو ایک اور جگہ بیان کرتے ہیں ؎

ان کی کیا عزت ہی یاروں قوم ہی جن کی ذلیل　　ان کی کیا راحت ہی جنکی قوم ہی سب خستہ حال
ہے وہ ایسا غول میں قلیوں کے جیسے ایک میٹ　　ہی ہزاروں مفلسوں میں ایک اگر آسودہ حال
شال گدڑی ہے ہی واں سو مرتبہ بدتر، جہاں　　ہوں ہزاروں گدڑیاں اور ایک کے کاندھے پہ شال

قوم کا لفظ حالی کے زمانے میں اس معین معنی میں استعمال نہیں ہوتا تھا جس میں آج ہونے لگا ہے۔ کبھی وہ پیشے وروں کی تخصیص کرتا تھا، کبھی کسی فرقے کے لیے بولا جاتا تھا اور کبھی پورے اہلِ ملک کے لئے۔ حالی نے اسے کہیں کہیں فرقے کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے لیکن جب سب اہلِ وطن کو خطاب کرنا ہوتا ہے اس وقت وہ قوم کا لفظ اُس وسیع معنی میں بولتے ہیں جس میں آج

بولا جاتا ہے۔ ایک سچے محبِ وطن کے قلبی تاثرات دیکھیے اور سر دھینئے ؎

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلمان اس میں یا ہندو — بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ملک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد

ہند میں اتفاق ہوتا گر — کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ — لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ

پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی — جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی

اور آج کل کے متعصب مسلمان اور متعصب ہندو حالی کی وطن کی سچی محبت اور حق گوئی پر غور کریں ؎

پاؤں اقبال کے اُکھڑنے لگے — ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے

کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا — کبھی دُرانیوں نے زر لوٹا

کبھی نادر نے قتلِ عام کیا — کبھی محمود نے غلام کیا

اور آخر میں ؎

سب سے آخر وہ لے گئی بازی — ایک شائستہ قوم مغرب کی

حالی کے دل میں ابتدا سے وطن اور اہلِ وطن کی سچی محبت بسی ہوئی تھی لیکن اس زمانے میں انتشار اور ابتری، بدامنی اور مصیبت کا دور دورہ تھا اور یہ ہولناک طوفان ۱۸۵۷ء میں انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اس ہنگامۂ کشت و خون کے بعد جب ذرا امن ہوا۔ اور انگریزی حکومت نے اپنا پورا تسلط جما کر ملک میں ظاہری امن و امان قائم کیا تو نوجوان حالی نے بھی اُسے ملک اور قوم کے لئے فالِ نیک

سمجھا اور سر سید کی طرح ان کو بھی یہی خیال ہوا کہ اس شائستہ اور ترقی یافتہ قوم کی بدولت ہم بھی پستی اور جہالت کے گڑھے سے نکل کر زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ترقی کے منازل طے کر سکیں گے۔ حالی شاید یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح صدیوں پہلے دوسرے حملہ آور ہندوستان کو فتح کر کے یہیں کے ہو رہے تھے اور اپنا سود و زیاں سب کچھ اسی ملک سے وابستہ کر دیا تھا، جو اُن کا اپنا تھا وہ ملک کو بخشا، جو ملک کا تھا اُس سے خود فیض اٹھایا اور ہمیشہ کے لئے ہند میں رس بس گئے اسی طرح یہ نئی مغربی قوم بھی ہندوستانی بن کر ہندوستان میں رہے گی اور ہندوستانی اس کے علم و فراست و تجربے سے فیض اٹھائیں گے۔ اسی لئے وہ انگریزی حکومت کی تعریف کرتے اور قوم کو اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کرتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ حالی پر یہ حقیقت کھل گئی کہ نئے حاکم ہندوستان کا بھلا نہیں اپنے ملک کا فائدہ چاہتے ہیں۔ وہ فاتح نہیں تاجر ہیں۔ وہ اس ملک میں نفاق، افلاس، اور تعصب پھیلا کر اپنا گھر بھرنا چاہتے ہیں ؎

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح ۔۔۔ واں پاؤں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اسکے تھی یہ مشورہ دیتی ۔۔۔ یہ حرفِ سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر ۔۔۔ مانو اُسے، اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام کئے جاؤ وہ لیکن ۔۔۔ جو بات سُبک ہو اُسے منہ سے نہ نکالو

رائے کے بجائے سیاست کا لفظ رکھ لیجئے۔ انگریزی سامراج کی ساری پالیسی اور حکمت کو چند شعروں میں کس طرح آئینہ کر دیا ہے۔

اور پھر جب حالی نے یہ دیکھا کہ مغربی قوم کی لوٹ محض مادّی چیزوں تک محدود نہیں بلکہ اس کی "حکمت" اور "سیاست" کی بدولت مشرقی قوموں کی علمی اور اخلاقی حالت بھی بد سے بدتر ہوتی جاری

ہے تو وہ بے اختیار چلا اٹھتے ہیں ؎

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن — حذر اُس لوٹ سے جو لوٹ ہی علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں — یہ گلچینی ہی یا لُٹس ہے گلچیں یا ہے قزاقی

جب وہ دیکھتے ہیں کہ بدیشی ہر جگہ دیسیوں کو ذلیل کرتے ہیں، ہر موقع پر "کالے" اور "گورے" کا فرق کیا جاتا ہے تو ان کا غیرت مند دل تڑپ اٹھتا ہے۔ انہوں نے طنزیہ انداز میں اس فرق کو خوب بیان کیا ہے۔ ایک "کالا" اور ایک "گورا" دونوں بیماری کا سارٹیفکٹ لینے ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں، راستے میں دونوں میں تکرار ہو جاتی ہے۔ "گورا" "کالے" کو نیم جان کر دیتا ہے اور آخر "کالا" ڈولی پر ڈال کر اور "گورا" گھوڑے پر سوار جب ڈاکٹر کے پاس پہنچتا ہے تو ڈاکٹر نے ؎

دی سند گورے کو لکھ تھی جس میں تصدیقِ مریض — اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے — کر نہیں سکتا حکومت ہند میں وہ زینہار
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند — کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے — آئے ہا با اُس کی بیماری کا کیوں کر اعتبار

حالی کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا کہ انگریزی حکومت سے جو توقعات انہوں نے قائم کی تھیں وہ پوری ہوتی نظر نہیں آتیں تو اُن کے دل میں بار بار ایک کانٹا سا کھٹک اُٹھتا ہے ؎

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا؟ — دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا

کبھی بے چین ہو کر کہہ اُٹھتے ہیں۔

داد طلب سب غیر ہو جب تو اُن میں کسی کا پاس نہ ہو — تبلائی ہے زمانے نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں
صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا — دیکھ کے اُس کو سارے تمہارے آ گئے یاد احسان ہمیں

اگر حالؔی کچھ عرصے اور زندہ رہتے اور ملک وقوم کی وہ ابتر حالت اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو کیا عجب ہے کہ وہ کھلم کھلا میدان میں اُتر آتے اور جس حق گوئی اور بیباکی سے انہوں نے قوم کو اس کی غلطیوں سے آگاہ کیا تھا اُسی جراتِ رندانہ سے وہ حکومت کی مخالفت کرتے۔

یہ بات تو حالؔی اُسی وقت سمجھ گئے تھے ملک کی نہ صرف ترقی و بھلائی بلکہ آزادی کا راز بھی اتفاق میں ہے

ایک موقع پر ہندو مسلم محبت کے کسی منظر کو دیکھ کر مسرت سے بے خود ہو کر کہہ اُٹھتے ہیں ؎

صد شکر وطن سے کوچ نفرت نے کیا — گھر اہلِ وطن کے دل میں الفت نے کیا

تقریروں سے ہو سکا نہ تحریروں سے — جو کارِ نمایاں کہ محبت نے کیا

آج حالؔی زندہ ہوتے اور اہلِ وطن کی آپس میں یہ تفریق و تعصب، نفرت و عداوت دیکھتے تو کیا کہتے؟

برگ و بار

اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے حالی کی ادبی اور قومی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "تاریخ سیاسی میں، تاریخِ تعلیمی میں، تاریخِ معاشرت میں، تاریخِ ادب میں، جہاں کہیں پچھلی نصف صدی میں کسی صحیح حرکت کی روانی دکھائی دے تو اُس کا سلسلہ اُس ادیب، شاعر، مصلح، محبِّ وطن اور سب سے زیادہ اُس صاف دل اور فرشتہ خصائل انسان کی کاوشِ ذہنی کے چشمۂ صافی سے جا ملتا ہے ......"

اس "فرشتہ خصائل انسان" کی سیرت اور عملی خدمات ایک ادھورا سا خاکہ آپ نے گذشتہ صفحات میں دیکھا۔ آیئے اب ہم ان پر بحیثیت شاعر کے ایک نظر ڈالیں۔

اس تبصرے میں حالی کی شاعری کی ہر صنف غزل، مثنوی، مسدس وغیرہ پر الگ الگ اختصار سے بحث کی جائے گی۔ سب سے پہلے میں حالی کی غزل کو لیتی ہوں جس سے اُن کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔

حالی کی غزل

ہمارے ہاں جو شخص ایک اچھا سا تخلص رکھ لے، کچھ تک بندی کر سکے یا پرانے شاعروں کے کلام میں کچھ رد و بدل کر کے اُسے اپنا سکے، عام طور پر لوگ

اُسے شاعر مان لیتے ہیں۔ گنتی کے اہلِ ذوق ہیں جو شاعر اور ناشاعر میں تمیز کر سکتے ہیں۔

"تخیل کی تیزی، نظر کی باریکی، حسن اور تناسب کی پرکھ، احساس کی شدت خصوصاً محبت اور خودی کے جذبات کی فراوانی" ان اجزا کی ترکیب سے شاعر بنتا ہے۔ اگر کسی انسان میں یہ ساری کی ساری خصوصیات بیک وقت موجود نہیں تو وہ اور سب کچھ ہو سکتا ہے مگر شاعر نہیں ہو سکتا۔ اُس کے لئے ان خصوصیات کا ہونا لازمی ہے اور شاعر و متشاعر میں ہم اسی سے فرق کر سکتے ہیں۔

لیکن شاعر شاعر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اکثر شاعر محض داخلی جذبات اور احساسِ خودی کی تسکین ہی کو شعر کی معراج سمجھتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا شاعر بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کی نظر میں شاعری کا مقصد اس سے زیادہ وسیع اور بلند ہوتا ہے۔ اس فرق کی دو وجہیں ہیں ایک تو طبیعت اور سیرت کا اختلاف، دوسرے زمانے اور ماحول کا اثر۔ شاعر جیسے زمانے میں پیدا ہوتا ہے اس کا بہت گہرا اثر قبول کرتا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے اپنے مضمون حالی میں اس فرق کو یوں بیان کیا ہے۔

"اگر زمانہ انتشار کا ہے، معاشرت کا شیرازہ بکھر چکا ہے، فرد کا رشتہ جماعت سے ٹوٹ گیا ہے، سب اپنے اپنے حال اور اپنی اپنی فکر میں ہیں تو شاعر بھی باہر کی دنیا سے آنکھ بند کر کے اندر کی دنیا میں ڈوب جاتا ہے۔ اُس کا تخیل اور اُس کا مشاہدہ نفس کے دائرے کو اپنی جولانی کے لئے تنگ پاتا ہے تو اس واردات کو جو اُس کے قلب پر گزرتی ہے بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور اُس میں نئی نئی

باریکیاں پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ مشاہدے کی قید ہی ٹوٹ جاتی ہے محض خیال کے جادو سے وہ ایک طلسم حیات باندھتا ہے اور اُس میں مگن رہتا ہے۔ اُس کی نظریں حسن اور تناسب کو ڈھونڈتی ہیں مگر وہ عالم فطرت اور عالم معاشرت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ اپنے مذاق کے مطابق ایک خیالی پیکرِ حسن تراشتا ہے اور اس کی خفیف سی جھلک کسی انسان میں دیکھ کر اُسے اپنا معشوق بنا لیتا ہے۔ محبت کا جذبہ جس کی وسعت نامحدود ہے سمٹ کر اسی ایک مرکز پر قائم ہو جاتا ہے اور اُس کی شدّت بہت بڑھ جاتی ہے...... خودی کا جذبہ جو اس داخلیت کی فضا میں پھیل کر خود پرستی کی حد تک پہنچتا ہے محبت یا عشق کا حریفِ مقابل بن جاتا ہے۔ عشق اور خودی کی اس کش مکش سے شاعر کی نفسی زندگی میں ایسے پیچ پڑ جاتے ہیں جو کھولے نہیں کھلتے۔ وہ وارفتہ مزاج، بے چین، اور چڑچڑا ہو جاتا ہے، وہ شدّت سے محبت کرتا ہے اور اس سے زیادہ شدّت سے شکایت کرتا ہے......"

انیسویں صدی میں اُردو شاعری کچھ اسی رنگ میں رنگ گئی تھی۔ اس دور میں ہمیں ایسے شاعروں کی بڑی کثرت نظر آتی ہے جن کی نفسی اور ذہنی کیفیت بعینہٖ وہ تھی جس کا جیتا جاگتا نقشہ مندرجہ بالا اقتباس میں کھینچا گیا ہے لیکن شاعر کی ایک اور شان بھی ہے اور یہ اُس زمانے میں اُجاگر ہوتی ہے جب زمانہ سازگار ہو، اجتماعی روح زندہ ہو اور افراد کا رشتہ زندگی اور کائنات دونوں سے قائم ہو اور شاعر اپنی فطری خصوصیات کو نشو و نما دے سکے تو یہی شاعر ہے جس کی شاعری پر "جزویست از پیغمبری" کی تعریف صادق آتی ہے۔ اس سچے شاعر کے خد و خال بھی ڈاکٹر عابد حسین نے بڑی صناعی کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

"تخیلؔ کی تیزی، مشاہدے کی وسعت کے ساتھ مل کر اُسے خدا کی دنیا اور انسان کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دکھاتی ہے۔ اس وسیع جلوہ گاہ میں اُسے حسن اور تناسب کا حقیقی جلوہ، حسنِ صورت اور حُسنِ معنی کا صحیح امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ فطرت کی ہم آہنگی اور معاشرت کے توازن سے آشنا ہوتا ہے تو اس کے جذبات میں بھی ربط و ضبط اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ اُس کا جذبۂ محبت نوعی ہمدردی کے ساتھ مل کر اس قدر وسعت حاصل کرتا ہے کہ دوستی، صلہ رحم، حبِ وطن، حبِ انساں سب پر حاوی ہو جاتا ہے اور اگر وہ حبِ الٰہی کا حوصلہ کرے تو اُسے زیب دیتا ہے۔ شاعر کی خودی کو یہ عالم گیر محبت کانٹ چھانٹ کر سنوارتی ہے۔ انانیت کے کانٹے نکل جاتے ہیں۔ خودداری، غیرت، اعتمادِ نفس کے پھول باقی رہ جاتے ہیں۔ زندگی اور خیالات کی حقیقت اور ہم آہنگی اسلوبِ بیان سے سادگی اور سچائی بن کر ٹپکتی ہے ...... یہ شاعر متین، خوش مزاج، منکسر اور بردبار ہوتا ہے ...... درد و سوز اسی کا حصّہ ہے اس لئے کہ اُسے صرف اپنا ہی غم نہیں سارے جہان کا غم ہوتا ہے۔ عاشقی کا دعوےٰ اس کو پھبتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی خودی کا عکس معشوق کی ذات میں نہیں ڈھونڈتا بلکہ معشوق کی حقیقی صفات کو دیکھ کر بے ساختہ اُس کی طرف کھنچتا ہے۔ زندگی کی تلخیاں اُسے بھی چکھنی پڑتی ہیں۔ محبت کی کڑیاں اُسے بھی جھیلنی پڑتی ہیں مگر وہ ضبط و متانت کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ فریاد بھی کرتا ہے تو سادگی اور سچائی سے ....."

شاعر کے اس تصوّر کو ذہن میں رکھ کر ہمیں حالیؔ کی شاعری کا جائزہ لینا ہے، اُنہیں زمانہ سازگار نہیں ملا تھا مگر اپنی فطری اُپج اور خداداد صلاحیتوں سے کام

لے کر انہوں نے وہ سیدھا راستہ اختیار کیا جو شاعر کو معراجِ کمال پر پہنچاتا ہے۔

وہ قدرت کی طرف سے شاعری کا مادّہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ حسن وتناسب کی پرکھ، شدتِ احساس، دردِ دل کی نعمت، تخیّل کی تیزی اور مشاہدے کی گہرائی وہ خصوصیات تھیں جو فطرت نے فیاضی کے ساتھ حالؔی کو ودیعت کی تھیں۔ بچپن ہی سے رنج ومصائب سے دوچار ہونے کے سبب دل میں سوز و گداز پیدا ہو گیا تھا۔ جن استادوں نے ابتدائی عمر سے پڑھایا ان میں سے کئی بزرگ شاعری کا بڑا اچھا ذوق رکھنے والے تھے۔ اور عربی و فارسی شاعری پر انہیں عبور حاصل تھا۔ حالؔی کے ذوقِ سخن کو سنوارنے میں ایک حد تک ان کا حصّہ بھی ہے۔

جب سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں حالؔی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے دلّی گئے۔ تو وہاں بھی انہیں ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا نظر آیا۔ غالؔب ذوقؔ اور مومنؔ جیسے باکمال شاعروں کا دور تھا۔ حالؔی کو اکثر مشاعروں میں ان کا کلام سُننے کا اتفاق ہوتا اور دل میں ذوقِ سخن گوئی کا احساس اُبھرتا۔ مگر شاعری کی چنگاری ابھی دل کی گہرائیوں میں دبی ہوئی تھی۔ وہ تحصیلِ علم کے شوق میں سخن گوئی کے فطری جذبہ کو غیر محسوس طور پر کچلتے رہے۔ لیکن شاعری کو پرکھنے اور شعر کو سمجھنے کا شوق اور تیز ہو گیا۔ غالؔب کا کلام جسے بڑے بڑے سخن گو اور سخن فہم حضرات سمجھنے سے قاصر رہتے تھے حالؔی نے خود غالؔب سے سمجھنا شروع کر دیا۔ شعر و شاعری کی یہ دلکش فضا جو ساری دلّی پر چھائی ہوئی تھی اور غالؔب کی ذوق آفریں صحبت شاید ناشاعر کو بھی شاعر بنا دیتی۔ حالؔی کتنا ہی دباتے بھلا شعر گوئی کا فطری جوہر اپنا کام کئے بغیر رہ سکتا تھا؟

دلی اُپچ سے مجبور ہو کر اُسی زمانے میں حالؔی نے چند غزلیں کہہ کر غالؔب کو دکھائیں غالؔب جیسا جوہر شناس ایک نظر میں پرکھ گیا کہ یہ نوجوان قدرت

کی طرف سے شعر کا سچا ذوق اور حقیقی شاعر کی ساری خصوصیات لے کر آیا ہے۔ یہ غالب کی نظر کا کمال ہے کہ انہوں نے ایک ایسے شاعر کو ابتدا ہی سے پرکھ لیا۔ جس کا شعر گوئی کا انداز اور شاعری کا نظریہ اُن سے بالکل مختلف ہونے والا تھا۔ انہوں نے حالی سے یہ کہہ کر کہ "تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے۔" وہ انچھر پھونک دیا جس سے حالی کی شاعری کے سوتے کھل گئے۔

حالی کے بچپن اور نوجوانی کا زمانہ ہندوستان کی پستی اور تنزل کا انتہائی دور تھا۔ اجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ تمدنی اور معاشرتی پستی حد کو پہنچ گئی تھی۔ مغلیہ سلطنت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ لوگ اجتماعی زندگی کی اہمیت اور عزت سے بے خبر اور بیگانہ اپنی اپنی انفرادی زندگی میں مگن تھے۔ انہوں نے باہر کی دنیا کے انتشار، ابتری اور تباہی سے ڈر کر عقل اور دماغ کی کھڑکیاں بند کر لی تھیں اور دل کی تسلّی کے لئے ایک من کی دنیا الگ بنالی تھی۔ امیر مال مست تھے اور فقیر حال مست۔ عالم اپنی علمی دنیا میں محصور اور صوفی اپنے وارداتِ قلب میں مقید۔ شاعر اپنی خود پسندی اور عشق پرستی میں گرفتار۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ کسی کو یہ فکر نہ تھی کہ کشتی ڈوبی تو سب کو ساتھ لے کر ڈوبے گی۔ نہ علم کا شیدائی عالم بچے گا نہ تارک الدنیا زاہد۔ نہ عیش پرست رئیس نہ تخیل پرست شاعر.....

ادب اور شاعری میں انفرادیت اور داخلیت کا رنگ اور بھی زیادہ گہرا تھا۔ ادیب اور شاعر زندگی کی ترجمانی کا فرض ادا کرنے کے بجائے اپنی اپنی خیالی دنیائیں بنا کر اُس میں قلعہ بند تھے۔ اور زندگی کے تقاضوں اور شاعر کے اصلی کام سے منہ موڑے بے وقت کی راگنی گا رہے تھے۔

حالیؔ بھی اسی دورِ تنزل میں پیدا ہوئے تھے۔ جس میں عشق و عاشقی کے اصلی یا فرضی ترانے گانے کا نام ہی شاعری سمجھا جاتا تھا۔ حالیؔ لاکھ پاک باز سہی مگر شعر گوئی کے لیے رندِ شاہد باز بننا ضروری تھا۔ شاعری کی محفل میں داخلہ کی شرط ہی یہ تھی کہ وہی پرانا راگ الاپا جائے۔ "ایک[1] مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔ خود بھی جب یہ سودا اچھلا آنکھیں بند کیں اور اسی شارع عام پر پڑ لیے جس پر راہگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلے کا ساتھ، راہ کی ہمواری اور رہ گذر کی فضا چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کا خیال بھی نہ آیا......"

راہ کی ہمواری، زمانے کا اثر اور پھر جوانی کا جوش اور ولولہ۔ حالیؔ جن کی فطرت "انفرادیت اور داخلیت سے کوسوں دور تھی" اس داخلی اور انفرادی شاعری کے چکر میں پڑ گئے جو عشق و عاشقی اور اظہارِ خودی تک محدود تھی۔ حالیؔ نے بھی اپنے اور ہم عصروں کی طرح اپنا میدانِ سخن غزل ہی کو قرار دیا، اور اس میں اپنے جوہر دکھانے لگے لیکن فطری صلاحیت میرؔ اور سعدیؔ جیسے شاعروں کے روحانی فیض اور غالبؔ و شیفتہؔ جیسے صاحبِ ذوق شعرا کی صحبت اور تربیت کی بدولت حالیؔ اس میدان میں بھی بڑی حد تک سنبھلے رہے۔ چنانچہ ان کے اس دور کے کلام میں بھی نہ تو وہ عامیانہ اور گھٹیا مذاق نظر آتا ہے جس کی بنیاد سطحی عشق اور ہوا و ہوس کے جذبات پر رکھی جاتی ہے اور نہ معاملہ بندی اور کنگھی چوٹی کا وہ ذکر ہے جو اُس وقت بیشتر شاعروں کا موضوع تھا۔ وہ تخیل کی ان غیر قدرتی رفعتوں پر بھی نہیں اڑتے جس سے شعر ایک گورکھ دھندا بن جاتا ہے۔ نہ دور از کار تشبیہوں، مبہم استعاروں کا وہ جال بُنتے ہیں جس میں اُلجھ کر

---

[1] دیباچہ دیوانِ حالی

شعر کا مطلب خبط ہو جائے۔ انہوں نے اپنے روحانی استادوں اور زندہ استادوں سے اپنی طبیعت اور صلاحیت کے مطابق استفادہ کیا تھا۔ میرؔ سے دردِ دل لیا اور دردؔ سے تصوّف کی چاشنی۔ غالبؔ سے حُسنِ تخیّل، ندرتِ فکر اور شوخیٔ گفتار سیکھی اور سعدیؔ سے بیان کی سادگی اور معنی کی گہرائی۔ اور شیفتہؔ سے "سیدھی سچّی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانے" کا فن۔ اور ان سب کی ترکیب سے حالیؔ کی غزل کا ہیولےٰ تیار ہوا۔ اگرچہ یہ خصوصیات غزل سے زیادہ اُن کے مسدس اور مثنوی میں جاکر چمکیں مگر غزل میں بھی ان کی انفرادیت اُجاگر کر گئیں۔ ان کی غزل میں سادگی، اصلیت اور حقیقت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ وہ جذبات اور احساسات کو اس ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں کہ ان میں دل کی سچّی لگن اور اس کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس کا ثبوت ملے گا۔

ہم روزِ وداع اُن سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا؟

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا؟

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

اے دل رضائے دوست ہے شرطِ رضائے غیر
زنہار بارِ عشق اٹھایا نہ جائے گا

مے تند و ظرفِ حوصلۂ اہلِ بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

اغماض چلتے وقت مروّت سے دور تھا
رُو رُو کے ہم کو اور رُلانا ضرور تھا

[illegible] ورنہ یہاں
ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا

دردا کہ لب پہ ازدل آیا نہ تھا ہنوز
چرچا ہمارے عشق کا نزدیک دور تھا
روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا
کچھ صبح ہی سے شامِ بلا کا ظہور تھا
حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شاد ماں
تھا حوصلہ اُسی کا کہ اتنا صبور تھا

قلق اور دل کا سوا ہو گیا
دلاسا تمہارا بلا ہو گیا
دکھانا پڑے گا ہمیں زخمِ دل
اگر تیر اُن کا خطا ہو گیا
وہ اُمید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا
سمجھتے تھے جس غم کو ہم جاں گزا
وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا
نہ دے میری اُمید مجھ کو جواب
رہے وہ خفا گر خفا ہو گیا
ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

اک خو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا
آؤ مٹا بھی دو خلشِ آرزوئے قتل
کیا اعتبار زندگئ مستعار کا
گر صبح تک وفا نہ ہوا وعدۂ وصال
سُن لیں گے وہ مآل شبِ انتظار کا
اب محوِ بوئے گل پہ ہوا کب دلِ حزیں
ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا میری رسوائی کا
عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا
تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعوےٰ ہے شکیبائی کا
یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں
گل و بلبل کی شناسائی کا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کا — ہے جو یہ شوق خود آرائی کا
ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

وہ دن گئے کہ حوصلہ ضبطِ راز تھا — چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب
آنے لگا جب اُس کی تمنا میں کچھ مزا — کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب
لغزش نہ ہو، بلا ہے حسینوں کا التفات — اے دل سنبھل وہ دشمنِ دیں مہرباں ہے اب
ہے وقتِ نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز — ہاں جذبِ دل مدد کہ دم امتحاں ہے اب
حالی تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش — وہ علم دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب؟

پیغام دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز — جھونکا نسیمِ مصر کا آیا نہیں ہنوز
یاں دے چکی جواب امیدِ جوابِ خط — واں نامہ بر نے بار بھی پایا نہیں ہنوز

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
یارب اس التفات کا انجام ہو بخیر — تھا اس کو ہم سے اُنس مگر اس قدر کہاں
اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر — اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
مجھ کو تم سے پہ اعتمادِ وفا!
تم کو مجھ سے پہ التفات نہیں
کوئی دل سوز ہو تو کیجیے بیاں
سرسری دل کی واردات نہیں
رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ
زندگی موت ہے حیات نہیں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کہیں انجام آ پہنچا وفا کا
گھُلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں
کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
نیا ہے لیجیے جب نام اُس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دلِ پر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں
بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

نہ واں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے
محبت ہے کہ دل میں موج زن ہے
بہت لگتا ہے دل محفل میں اُس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے
بہت دل ہیں ترے عاشق کو درکار
تری جو بات ہے وہ دل شکن ہے
دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد؟
نہ میں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے

رہروے تشنہ لب نہ گھبرانا
اب لیا چشمۂ بقا تو نے
دور ہو اے دلِ مآل اندیش
کھو دیا عمر کا مزا تو نے
اک بیگانہ وار کر کے نگاہ
کیا کیا چشمِ آشنا تو نے

حالی کے کلام میں جا بجا تصوف کی چاشنی بھی نظر آتی ہے۔ جدید اور قدیم دونوں زمانے کی غزلوں میں یہ رنگ حالی کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ لیکن ان کی راہ رسمی تصوف سے الگ ہے۔ وہ اپنے کو پہنچا ہوا صوفی اور عارفِ کامل سمجھ کر حقیقت کے رموز و اسرار بیان کرنے کا دعوےٰ نہیں کرتے بلکہ اپنی نارسائی اور عجز کے اظہار ہی کو معراجِ محبت سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اکثر بڑے پتے کی اور دل میں چبھنے والی باتیں کہہ جاتے ہیں ؎

پیشِ از ظہورِ عشق کسی کا نشاں نہ تھا　　تھا حسن میزبان کوئی میہماں نہ تھا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی　　ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

اس سے ناداں ہی بن کر ملیئے　　کچھ اجارہ نہیں دانائی کا

کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے　　جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں

شہسواروں پہ بند ہے جو راہ　　وقف ہے یاں شکستہ پاؤں پر

عشق کے بھی خوب دیکھے ساز و سوز　　دل پہ کھلتا ہے نیا اک راز روز

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

محتسب عذر بہت ہیں لیکن
اذن ہم کو نہیں گویائی کا

رازِ دل کی سرِ بازار خبر کرتے ہیں
آج ہم شہر میں خوں اپنا ہدر کرتے ہیں

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر
تم میں رُوپ اے گل و نسرین و سمن کس کا ہے
عشق اُدھر عقل اِدھر دھن میں چلے ہیں تیری
راستہ دیکھئے دونوں کٹھن کس کا ہے

اصل مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتہ
ورنہ ہم اور کسی شے کے طلبگار نہیں

غمزدوں رنج و مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ
دل دُکھاتے ہیں وُہی جس میں کہ گھر کرتے ہیں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

زباں تقریر سے قاصر، قلم تحریر سے عاجز
نہ پوچھو ہم سے کیا دیکھا ہے ہم نے بزمِ رنداں میں

کل خرابات میں ایک گوشے سے آتی تھی صدا
دل میں سب کچھ ہے مگر رخصتِ گفتار نہیں

ملتیں، رستوں کا ہیں سب ہیر پھیر
سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

در فیضِ حق بند تھا جب، نہ اب کچھ — فقیروں کی جھولی میں اب بھی ہے سب کچھ
ہر ایک کو نہیں ملتی یاں بھیک واعظ — بہت جانچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ
یہ طبلِ تہی ہیں، جو بڑ کارتے ہیں — جنہیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

وصل کا اُس سے دلِ زار تمنائی ہے — نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے

واں رسائی ہے صبا کی اور نہ قاصد کو ہے بار — اُس سے آخر کس طرح پیدا تعارف کیجئے

قدرِ نعمت ہے بقدرِ انتظار — حشر پر ٹھیری ہے مہمانی مری

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

ہے تجلی بھی نقابِ روئے یار — اس کو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیئے

ابتدائے وفا ہے سر دینا — میری دیکھی نہ انتہا تو نے

کر کے بیمار دی دوا تو نے — جان سے پہلے دل لیا تو نے
رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا — اب لیا چشمۂ بقا تو نے

دل کو درد آشنا کیا تو نے — دردِ دل کو دوا کیا تو نے
تھا نہ جز غم بساطِ عاشق میں — غم کو راحت فزا کیا تو نے

تھی جہاں کارواں کو دینی راہ — عشق کو رہنما کیا تو نے
جب ملی کامِ جاں کو لذتِ درد — درد کو بے دوا کیا تو نے
جب دیا راہ رَو کو ذوقِ طلب — سعی کو نارسا کیا تو نے
پردۂ چشم تھے حجاب بہت — حُسن کو خود نما کیا تو نے
عشق کو تابِ انتظار نہ تھی — غرفہ اک دل میں وا کیا تو نے
حرم آباد اور دیر خراب — جو کیا سب بجا کیا تو نے

بری اور بھلی سب گزر جائے گی — یہ کشتی یونہیں پار اتر جائے گی
ملے گا نہ گلچیں کو گل کا پتہ — ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا — کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں اُمیدیں نہ ہوں — یونہی عمر ساری گزر جائے گی
سُنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا — یہی ایک دن کام کر جائے گی

دل کو درد آشنا کیا تو نے — دردِ دل کو دوا کیا تو نے
طبعِ انساں کو دی سرشتِ وفا — خاک کو کیمیا کیا تو نے
تھا نہ جز غم بساطِ عاشق میں — غم کو راحت فزا کیا تو نے
تھی محبت میں ننگ منتِ غیر — جذبِ دل کو رسا کیا تو نے
تھی جہاں کارواں کو دینی راہ — عشق کو رہنما کیا تو نے
جب ملی کامِ جاں کو لذتِ درد — درد کو بے دوا کیا تو نے
جب دیا راہ رو کو ذوقِ طلب — سعی کو نارسا کیا تو نے
پردۂ چشم تھے حجاب بہت — حُسن کو خود نما کیا تو نے

سخت افسردہ طبع تھے احباب — ہم کو جادو نوا کیا تو نے

پھر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا یارب — کون پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حالیؔ اُٹھا ہلا کے محفل کو

آخر اپنا کہا کیا تو نے

حالیؔ کے دوسرے دور کے کلام میں غزل کی ایک اور صورت ملتی ہے جس سے انھوں نے اخلاقی اصلاح کا کام لینا شروع کیا تھا۔ ان میں سے بعض جدید غزلیں بے شک وہ دلکشی اور حُسن نہیں رکھتیں جو حسن و عشق کی ان داستانوں میں نظر آتی ہے۔ غالباً اسی قسم کی کچھ غزلیں دیکھ کر بعض لوگ حالیؔ کی غزل کو پھیکی اور بے مزہ بتاتے ہیں۔ لیکن انھوں نے شاید حالیؔ کے سارے کلام کا بغور مطالعہ نہیں کیا ورنہ وہ ایسا فتوے نہ لگاتے۔ اس میں شک نہیں کہ جب حالیؔ نے اپنی غزل کو بھی اخلاقی اصلاح کے لئے وقف کر دیا اور اُس میں عاشقانہ اور تصوّفانہ کلام کی چاشنی کم ہو گئی تو پرانے مذاق کے لوگوں کو اُس میں حسن و دلکشی نظر نہ آئی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کہیں کہیں مصلحانہ رنگ شعریت پر غالب آ گیا ہے۔ لیکن اول تو کسی شاعر کے کلام پر حکم لگانے سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس کے تمام کلام کو ایک ہی معیار پر نہیں پرکھا جاتا۔ غالبؔ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے یادگارِ غالبؔ میں حالیؔ نے خود لکھا ہے "یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شاعر اور اُس کے کلام کے رتبے کا اندازہ اُس کے کلام کی قلّت اور کثرت سے نہیں ہوتا بلکہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اُس کے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ہیں۔ میرؔ کی قدر لوگ اس لیے نہیں کرتے کہ اُس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے بلکہ صرف اُس کے منتخب اشعار نے جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں اُسے تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج

بنادیا ہے ...... یہ بھی معلوم رہے کہ تمام شعرا کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا ہے ...." اسی لئے حالی کے دوسرے دور کی غزل کو جب انہوں نے ارادتاً اُسے اصلاحی مقصد کے لئے وقف کر دیا تھا غزل کے پرانے معیار پر جانچنا غلط ہے۔ البتہ اگر حالی کے بتائی ہوئی تنقید کی اس صحیح کسوٹی پر اُن کی منتخب غزلوں کو کسا جائے اور اُن میں سے ان کے بہترین اشعار کو چُنا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالی کی غزل بھی اپنے رنگ میں اتنی ہی پُر اثر، پُر درد اور دلکش ہے جتنی کسی اور بڑے غزل گو شاعر کی۔ بقول آلِ احمد سرور "وہ غزل کے خلاف ہیں لیکن اُن کی بہت سی غزلیں اردو شاعری کے ہر انتخاب میں جگہ پاسکتی ہیں۔ ان غزلوں میں ہجر و وصل بھی ہے اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ بھی مگر صرف یہی نہیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ....."

دورِ جدید کی غزلوں میں سے کچھ کا انتخاب پڑھیئے۔

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا — جس گھر سے سر اُٹھایا اُس کو بٹھا کے چھوڑا
راہوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے — گردن کشوں کو تو نے نیچا دکھا کے چھوڑا
فرہاد کوہکن کی لی تو نے جانِ شیریں — اور قیسِ عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا
لاگ اور لگاؤ دونوں ہیں دل گداز تیرے — پتھر کے دل تھے جن کے اُن کو رُلا کے چھوڑا
افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دل کش — شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

الفت میں دمبدم کچھ لذت ہے بڑھتی جاتی — چھوڑیگا کھا کے شاید عاشق کو غم تمہارا
ہوتے ہی تم تو پیدل کچھ رُو دیئے سوار و — ہے لاکھ لاکھ من کا اک اک قدم تمہارا

یارب طلبِ وصل ہو یا ہو طربِ وصل — جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

لی ہوش میں آنیکی جو ساقی سے اجازت
فرمایا، خبردار کہ نازک ہے زمانا

کہیں الہام منوانا پڑے گا
کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا

نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد
یہ گُر ناصح کو بتلانا پڑے گا

رٹے ہے وصفِ جناں کی مشق واعظ
تمہیں بچّوں کو پھسلانا پڑے گا

سخن میں پیروی کی گر سلف کی
انہیں باتوں دہرانا پڑے گا

کب تک اے ابرِ کرم ترسائے گا
مینھ بھی رحمت کا کبھی برسائے گا

دوست کا آیا ہی سمجھو اب پیام
آج اگر آیا نہیں کل آئے گا

ذوق سب جاتے رہے جز ذوقِ درد
اک یہ لپکا دیکھئے کب جائے گا

دل کے تیور ہی کہے دیتے تھے صاف
رنگ یہ دیوانہ اک دن لائے گا

باغ و صحرا میں رہے جو تنگ دل
جی قفس میں اُس کا کیا گھبرائے گا؟

ابر و برق آئے ہیں دونوں ساتھ ساتھ
دیکھئے برسے گا یا برسائے گا

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

کر دیا اُس نے تو اللہ سے غافل ناصح
اُس کو کیوں بھولتے گر اس کو بھلایا جاتا

چپ چپاتے اُسے دے آئے دل اک بات پہ ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چُکایا جاتا

دل کو یہ تو نے دُکھایا ہے کہ دُکھ جاتا ہے
چیونٹی کا بھی اگر دل ہے دُکھایا جاتا

نامہ بر آج بھی خط لے کے نہ آیا یارو
تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا

دل نہ طاعت میں لگا جب تو لگایا غمِ عشق
کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

راحت کا جہاں میں یونہی اک نام ہے گویا
راحت کی تلاش اک طمعِ خام ہے گویا

کچھ کرتے ہیں جو یاں وہی انگشت نما ہیں
بدنام ہی دنیا میں نکو نام ہیں گویا

ناچیز ہیں وہ کام نہیں جن پہ کچھ الزام
وہ کام ہیں ان کا یہی انعام ہے گویا

ہے وقت رحیل اور وہی عشرت کے ہیں ساماں
آخر ہوئی رات اور ابھی یاں شام ہے گویا

اٹھاتا تھا کچھ اول ہی سے یہ درد بُری طرح
آغاز ہی الفت کا بس انجام ہے گویا

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

اے دل رضائے غیر ہے شرطِ رضائے دوست
زنہار بارِ عشق اُٹھایا نہ جائے گا

مے تند و ظرف حوصلۂ اہلِ بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

ہے غمِ روزِ جدائی نہ نشاطِ شبِ وصل
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مرے تسلیم سپر کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

گر دردِ دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا
آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد

یادِ خدا میں جب ہٹ گئی دل سے اُس کی یاد
آگے خدا کا نام ہے ناصح خدا کے بعد

حالی کی سُن لو اور صدائیں جگر خراش
دلکش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

پیاس تیری بوئے ساغر سے لذیذ　　بلکہ جامِ آبِ کوثر سے لذیذ
لطف ہو تیری طرف سے یا عتاب　　ہم کو ہے سب شہد و شکر سے لذیذ
ہے یہ تجھ میں کس کی بُو باس اے صبا　　بُوئے بید و مشک و عنبر سے لذیذ
قند سے شیریں تیری پہلی نگاہ　　دوسری قندِ مکرّر سے لذیذ
لطف ہو تیری طرف سے یا عتاب　　ہم کو سب ہے شہد و شکّر سے لذیذ

یارب نگاہ بد سے چمن کو بچائیو　　بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ

جنّت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق　　بدلیں گے تجھ کو زندگی جاوداں سے ہم
ہنستے ہیں اُس کے گریہ بے اختیار پر　　بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو　　کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرزِ بیاں سے ہم
لذّت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ　　پوچھیں گے جا کے حالیِ جادو بیاں سے ہم

پھونکا ہے فصلِ گل نے صور آ کے پھر چمن میں　　اک حشر سا بپا ہے مرغانِ نغمہ زن میں
بلبل کے آگ سی کچھ تن من میں لگ رہی ہے　　بجلی گری فلک سے یا گل کھلا چمن میں
چپ ہے زبانِ سوسن حیراں ہے چشم نرگس　　قدرت کا دیکھ جلوہ نسرین و نسترن میں

حقیقت محرمِ اسرار سے پوچھ　　مزا انگور کا مے خوار سے پوچھ
وفا اغیار کی اغیار سے سن　　میری اُلفت درو دیوار سے پوچھ
ہماری آہِ بے تاثیر کا حال　　کچھ اپنے دل سے، کچھ اغیار سے پوچھ
دلِ مہجور سے سن لذّتِ وصل　　نشاطِ عافیت بیمار سے پوچھ

نہیں آبِ بقا جز جلوۂ دوست — کسی لب تشنۂ دیدار سے پوچھ
فغانِ شوق کو مانع نہیں وصل — یہ نکتہ عندلیبِ زار سے پوچھ

جنوں کار فرما ہوا چاہتا ہے — قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے
دمِ گریہ کس کا تصوّر ہے دل میں — کہ اشک اشک دریا ہوا چاہتا ہے
بہت کام لینے تھے جس دل سے ہم کو — وہ صرفِ تمنّا ہوا چاہتا ہے
فزوں تر ہے کچھ اندنوں فوقِ عصیاں — درِ رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں — نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی — الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں
کہتے ہیں جس کو جنّت وہ اک جھلک ہے تیری — سب واعظوں کی باقی رنگیں کہانیاں ہیں
ہر حکم پر ہوں راضی، ہر حال میں رہیں خوش — حصّے میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں
خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا — کچھ مقبروں میں باقی اُن کی نشانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں — گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

رونے میں تیرے حالی لذّت ہے اک نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

بوالہوس عشق کی لذّت سے خبردار نہیں — ہیں مےِ ناب کے دلّال قدح خوار نہیں
شہر میں ان کے نہیں جنسِ وفا کی بکری — بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے، یہ خریدار نہیں
کون سے وہ گلِ رعنا پہ نوا سنج نہیں — کون سی نرگسِ شہلا کے وہ بیمار نہیں

عیش میں جان فدا کرنے کو تیار ہیں وہ
اور جو ہو کیل کا کھٹکا بھی تو پھر یار نہیں

بوالہوس، کام طلب، بندۂ نفس، اہل ہوی
ایک عالم ہے اسی رنگ میں دو چار نہیں

دعوئے عشق و محبّت پہ نہ جانا ان کے
ان میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں

کہے حالی بھی اگر عاشق صادق ہوں میں
کہدو واللہ کہ صادق نہیں زنہار نہیں

ابھی حالی کی شاعری کی ابتدا ہی تھی۔ اور انہوں نے جوانی کی ترنگ میں عشقیہ شاعری کا ترانہ شروع ہی کیا تھا کہ ملک کو تباہی اور بربادی کے اُس ہولناک طوفان سے گزرنا پڑا جسے ۱۸۵۷ء کے غدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس دور میں ملک اور قوم کی بدحالی و پریشانی، بدامنی و انتشار اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اور ساتھ ہی لوگوں پر جمود اور بے حسی یا مایوسی اور شکست خوردگی طاری تھی۔ لیکن خدا کے کچھ بندے ایسے بھی تھے جنہوں نے اس طوفانِ مصیبت کے سامنے ہمّت اور ہوش و حوس کے ہتھیار نہیں ڈال دیئے بلکہ حالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ حالی نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے دل پر سہا تھا۔ ان کے دیکھتے دیکھتے ملک میں انگریزی حکومت کا اقتدار قائم ہو چکا تھا اور مغربی تہذیب اور مغربی علوم آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے۔ جن لوگوں نے اپنے دل و دماغ کی آنکھیں کھلی رکھی تھیں انہیں غدر کے ہنگامے نے یہ صاف طور پر دکھا دیا تھا کہ اب ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے جس میں مغربی علوم کا رواج ہونا لازمی ہے۔ اگر لوگوں نے اس وقت زمانے کا ساتھ نہ دیا تو وہ خس و خاشاک کی طرح زمانے کی رَو میں بہہ جائیں گے۔

نوجوان حالی شاید اُس وقت ان سب باتوں کو پوری طرح سمجھ نہ سکتے تھے لیکن غیر محسوس طور پر اُن کا ذہن انقلاب کے لئے تیار ہوتا رہا اور اُن کے کلام

اُن کی اُس وقت کی غزل پر نظر آتا ہے وہ درد و غم کا ہے۔ وہ اب عشقیہ بیان سے اُکتانے لگے تھے۔ دلّی پیاری دلّی کی تباہی و بربادی اور اہلِ کمال کا قحط اور علم و اخلاق کا زوال دیکھ کر عشقیہ راگ گانے والا شاعر دل پکڑ کر چلا اُٹھا ہے

جتنے رمنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق
آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

تذکرہ دلّی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رُلانا ہرگز

لے کے داغ آئیگا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلّی
ہم کو بھولے ہو پہ گھر بھول نہ جانا ہرگز

اس زمانے میں حالی نے جو کچھ کہا اس میں غالب کا مرثیہ شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اسے پڑھ کر صاف نظر آتا ہے اب شاعر رسمی بندشیں اور مروجہ شاعری کی قیدیں توڑنے لگا ہے اور اُس کا ذہن چپکے چپکے کسی انقلاب کے لئے تیار ہو رہا ہے اور وہ غیر شعوری طور پر اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ گو اُسے ابھی اس کا واضح احساس نہیں ہوا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "جب آفتابِ عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا وہ تمام سیمیائی جلوے جو خوابِ غفلت میں حقائق سے زیادہ دل فریب نظر آتے تھے رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے۔ غزل اور تشبیب کی امنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی اور جس شاعری پر ناز تھا اُس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھایا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔ جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں منہ کو لگا پھر ذرا مشکل سے چھٹتا ہے مگر زمانے کی ضرورتوں نے سبق پڑھایا کہ دل فریب مگر نکمّی باتوں پر آفرین سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سننی بہتر ہے۔ اور حاکمِ وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و بلبل کی قسمت کو تو بہت رو چکے کبھی اپنے حال

پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں"

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی — بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی

جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا — ہم نے بھی تیری رام کہانی چھوڑی

دل کی رام کہانی چھوڑ دی لیکن قوم کا جو روگ لگ چکا تھا اب اُس کی حالت پر آنسو بہانے میں مزا آنے لگا۔

اس زمانے میں حالی کو چار سال تک لاہور میں انگریزی کتابوں کے ترجمے کی اصلاح کا کام کرنا پڑا جس کی بدولت انہیں بہت سی مغربی تصانیف کو پڑھنے کا موقع ملا ان کو اس میں ایک نئی دنیا نظر آئی اور ان کے مذاق شعر و ادب پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اب حالی نے دیکھا کہ شعر و ادب کا میدان کتنا وسیع ہے اور اُس کا کام محض وارداتِ قلب کا بیان اور داستانِ عشق کا سنانا ہی نہیں بلکہ زندگی کی ترجمانی، کائنات کا مطالعہ، انسانوں کے اخلاقی اور معاشرتی معیاروں کو بلند کرنا بھی ہے۔ اور لوگوں کے دلوں میں قوم کی محبت اور خدمت کے جذبات کو ابھارنا بھی!

حالی مغربی ادب کا یہ اثر قبول کرتے رہے اور مذاقِ شعر نئے سانچے میں ڈھلتا رہا۔

اس زمانے میں مولوی محمد حسین آزاد نے لاہور میں ایک نئی قسم کے مشاعرے کی بنا ڈالی، حالی تو جیسے کسی ایسی تحریک کے منتظر ہی تھے۔ انہوں نے ان مشاعروں کے لئے چار نظمیں "برکھا رُت"۔ "نشاطِ امید"۔ "مناظرہ رحم و انصاف" اور "حبِّ وطن" لکھیں۔

برکھا رت کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حالی کا مشاہدہ کتنا گہرا اور نظر کتنی باریک تھی۔ اور مظاہرِ قدرت اور مناظر فطرت کو انہوں نے کس قدر غور سے دیکھا ہے ؎

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا — اک شور ہے آسماں پہ برپا

ہے ابر کی فوج آگے آگے　　اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے
گنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں　　جنّت کی ہوائیں آ رہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی　　قدرت ہے نظر خدا کی آتی
باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت　　کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
ہے سنگ و شجر کی ایک وردی　　عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار　　دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل　　ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو　　اور مور جھنکارتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی　　گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر　　کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر

ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں　　تیرا کوں کے دم بڑھے ہوئے ہیں
بگلوں کی ہیں ڈاریں آکے گرتی　　مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی
ناؤیں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں　　موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں
ملاحوں کے اڑ رہے ہیں اوساں　　بیڑے کا خدا ہی ہے نگہباں

ہیں شکر گزار تیرے برسات　　انساں سے لے کے تا جمادات
دنیا میں بہت تھی چاہ تیری　　سب دیکھ رہے تھے راہ تیری
تجھ سے ہی کھلا یہ رازِ قدرت　　راحت ملتی ہے بعد کلفت
گلشن کو دیا جمال تو نے　　کھیتی کو کیا نہال تو نے
امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ　　اک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ

حبِ وطن نہ صرف ان نظموں میں بلکہ اس موضوع پر آج تک جتنی نظمیں اردو میں لکھی گئیں غالباً ان سب میں بہترین ہے۔ روانی، دلکشی، حسنِ ادا اور سلاستِ بیان کے لحاظ سے بھی اور خیالات کے اعتبار سے بھی۔ اس میں شاعر نے وطن اور وطن کی محبت کے نظریے پر کئی پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے اور پھر بڑی خوبی اور وضاحت سے بتایا ہے کہ اس کے نزدیک حبِ وطن کا اصلی مفہوم کیا ہے۔ شروع میں وطن کی جذباتی محبت کا نقشہ کس خوبصورتی سے کھینچا ہے ؎

اے سپہرِ بریں کے سیارو — اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دل فریب فضا — اے لبِ جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری — اے شبِ ماہتاب تاروں بھری
اے نسیمِ بہار کے جھونکو — دہرِ ناپائیدار کے دھوکو
تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز — تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رمنا — تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
آن اک اک تمہاری بھاتی تھی — جو ادا تھی وہ دل لبھاتی تھی
پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار — جی ہوا تم سے خود بخود بیزار
نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے — نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور — یا تمہارے ہی کچھ بدل گئے طور

وطن کی یاد اور اس کی محبت کی مثالیں دینے کے بعد حالی پھر اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں ؎

نام ہے کیا اسی کا حُبِ وطن — جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کیا وطن کی یہی محبت ہے! — یہ بھی الفت میں کوئی الفت ہے

اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند اس سے خالی نہیں چرند و پرند
کہیے حبِ وطن اسی کو اگر ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کم تر

اس کے بعد حالیؔ دکھاتے ہیں کہ سچی حُبّ الوطنی کس کا نام ہے سہ

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو! اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
جب کبھی زندگی کا لطف اٹھاؤ دل کو دُکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر ہے کوئی ان میں خشک کوئی تر
سب کو ہے ایک اصل سے پیوند کوئی آزردہ ہے کوئی خرسند
مقبلو مدبروں کو یاد کرو خوش دلو غمزدوں کو شاد کرو
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
قوم سے جو تمہارے ہیں برتاؤ سوچو اے میرے پیارو اور شرماؤ
اہلِ دولت کو ہے یہ استغنا کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا
فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار خوش نویسوں کو ہے یہی آزار
الغرض جس کے پاس جو ہے چیز جان سے بھی سوا ہے اس کو عزیز
قوم پر ان کا کچھ نہیں احساں ان کا ہونا نہ ہونا ہے یکساں
قوم کیا کہہ کے ان کو روئے گی نام پر کیوں کہ جان کھوئے گی
تربیت یافتہ جو ہیں یاں کے خواہ بی اے ہوں ہمیں یا ایم اے
بند اس قفل میں ہے علم ان کا جس کی کنجی کا کچھ نہیں ہے پتا
کیجیے انصاف شرم کی جا ہے گر نہیں مجل یہ تو پھر کیا ہے!

تم نے دیکھا ہے جو وہ سب کو دکھاؤ — تم نے چکھا ہے جو وہ سب کو چکھاؤ
علم کو کر دو کو بکو ارزاں — ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں
گر رہا چاہتے ہو عزت سے — بھائیوں کو نکالو ذلت سے
قوم کا مبتذل ہے جو انساں — بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے — علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں یہ دور آئے گا — بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
گر نہیں سنتے قول حالی کا — پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

حالی کے ایک نقاد نے لکھا ہے کہ مولانا کا کلام "ان نیچرل" یعنی غیر فطری ہے اور مثال میں حالی کا یہ مصرع پیش کیا ہے "اے شبِ ماہتاب تاروں بھری" اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ایک دوسرے نقاد نے یہ عذر پیش کیا کہ "مولانا نے نیچر کا مطالعہ برگ درختاں سے نہیں بلکہ اوراقِ کتب سے کیا ہے اسی لیے ایسی غلطی کر گئے"۔ حالانکہ جس کسی نے حالی کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے وہ دیکھ سکتا ہے کہ حالی نے جہاں کہیں مناظرِ فطرت کی عکاسی کی ہے وہاں نظروں کے سامنے ان کی ایسی تصویریں کھینچی ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے ان کے ہر جُز کا عینی مشاہدہ کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ عذر کہ حالی نے "بروگ درختاں" سے فطرت کا مطالعہ نہیں بلکہ اوراقِ کتب سے کیا ہے صحیح نہیں۔ حالی عالم بھی تھے اور شاعر بھی۔ مگر نہ تارک الدنیا عالم اور نہ دنیا سے بیزار شاعر۔ اور ان کی ساری زندگی اور سارا کلام اس کا شاہد ہے کہ انہوں نے فطرت کو، انسان کو، دنیا کو، زندگی کو گہری نظر سے دیکھا اور بغور مشاہدہ کیا ہے۔ اب ذرا اس اعتراض کو لیجیے۔ "شبِ ماہتاب تاروں بھری" کو "ان نیچرل" سمجھنے والے نقاد نے شاید

"ماہتاب" کے معنی "بدر" کے سمجھے ہیں۔ اور یہ سمجھ کر اعتراض کیا ہے کہ بھلا ماہِ کامل کے وقت رات تاروں بھری کیسے ہو سکتی ہے۔ حالانکہ چاند خواہ وہ پہلی رات کا ہلال ہی کیوں نہ ہو تابناک ہوتا ہے اور چاندکی چھ سات تاریخ تک ماہ تاب کی رات تاروں بھری ضرور ہوتی ہے۔ حالیؔ کی ساری نیچرل شاعری میں سے ایک مصرعہ لے کر اور اُس کا بھی غلط مطلب سمجھ کر حالیؔ کو ان نیچرل شاعر کہنا یا ان کو "اوراقِ کتب" سے فطرت کا مشاہدہ کرنے والا بتانا دونوں سطحی نظر پر دلالت کرتے ہیں۔

حُبِّ وطن کو پڑھ کر یہ بات محسوس ہونے لگتی ہے کہ حالیؔ کے دل میں دردِ ملّت اور اصلاحِ قوم کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے اور اُن کا دل اس کی اصلاح کے لئے بے قرار ہے۔ شاعر کا ذہن نئی شاعری کو بھی قبول کر چکا ہے اور شعر و ادب کو زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی ہے۔ مگر ابھی تک مصلحانہ جوش اپنے مشن کا احساس اور اپنی شاعری سے کام لینے کا کوئی واضح تصور اُس کے ذہن میں نہیں ہے۔ اور ہوتا بھی کیسے؟ قوم کی ابتر اور مایوس کن حالت وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور رات کی تاریکی دور ہونے کی کوئی علامات ابھی تک افق پر نظر نہ آتی تھیں۔ چند نظمیں کہنے سے دل کو تسکین نہ ہوئی۔ لاہور سے دلّی آ گئے۔ لیکن افسردہ اور بے دل۔ پرانا سرمایہ نکما نظر آتا تھا اور وہ نئی امنگ ابھی پوری طرح بیدار نہ ہوئی تھی جس نے حالیؔ کو حالیؔ بنایا۔ بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اُسی ایک چکّر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہان طے کر چکے۔ جب آنکھ کھُلی تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں ؎

شکستِ رنگِ شباب و ہنوز رعنائی
دراں دیار کہ زادی، ہنوز جاں آئی

نگاہ اٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں، آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا۔

جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لئے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا۔ جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین میں محدود رہی ہو اُن سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا۔۔۔۔ چند روز اسی تردد میں گذرے کہ ایک قدم آگے پڑتا تھا اور دوسرا پیچھے ہٹتا تھا۔۔۔۔۔"[1]

---

[1] دیباچہ مسدس حالی

مسدس حالی

حالی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے کہ اس زمانے میں ان کی ملاقات سر سید سے ہوگئی۔ یعنی اُس ناخدا سے جس نے قوم کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے میں اپنی جان لڑا رکھی تھی۔ اور جو تقریباً بیس برس سے اپنی جاہل، بے عمل، خوف زدہ اور شکست خوردہ قوم کو ابھارنے اور سیدھے رستے پر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی "ایک[1] نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ہارے خستہ دکوفتہ اسی دشوار گزار راستے پر پڑ لئے .... زمانے کا ٹھاٹ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہوگیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے ابھاروں سے دل بڑھتا تھا نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا مگر یہ ایک ایسے ناسور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے بخارات اندرونی جن کے رُکنے سے دم گھٹا جاتا تھا، دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈتے تھے۔ قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے .... آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعوےٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے .... ہر چند کہ اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اُٹھانا دشوار تھا، ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دل ہی سے نکلی تھی دل ہی جا کر ٹھیری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک

---

[1] دیباچہ مسدس حالی

دلولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں ابال آیا۔ افسردہ دل اور بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، انہیں سے کام لینا شروع کیا۔ اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی دی ...."

اب حالی اپنی مسدس کی دھن میں لگ گئے۔ بیماریوں، پریشانیوں، مشکلوں سب نے نرغہ کیا لیکن ان کی ہمت کو مغلوب نہ کرسکیں۔ سرسید کی مضراب نے ساز دل کے اس تار کو چھیڑ دیا جس میں نئے دل سوز نغمے چھپے ہوئے تھے ...... اب شاعر کو مقصدِ حیات معلوم ہو چکا تھا جس کی خاطر وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس عزم کا پہلا کارنامہ مسدسِ حالی تھا۔

حالی نے جب یہ کتاب لکھی تو وہ خوب جانتے تھے کہ وہ ملک کے سامنے شاعری کا ایک نیا نمونہ پیش کر رہے ہیں اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ قدامت پسند لوگ اس "بدعت" کو ناپسند کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس دیباچے میں لکھا بھی[1] "ہمارے ملک کے اہل مذاق ظاہرا اس روکھی پھیکی سیدھی سادھی نظم کو پسند نہ کریں گے۔ کیونکہ اس میں تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے یا جو آج قوم کی حالت ہے اُس کا صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگیں بیانی نہ مبالغے کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی .... گویا اہلِ دلی اور اہلِ لکھنؤ کی دعوت میں ایسا دستر خوان چُنا گیا ہے جس میں اُبالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر اس نظم کی ترتیب واہ واہ سننے اور مزے لینے کے لئے نہیں کی گئی ہے بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لئے ...."

حالی کا اندازہ ایک حد تک صحیح نکلا۔ جب یہ مسدس جو اُردو شاعری میں

---

[1] دیباچہ مسدس حالی

انقلاب کی علم بردار تھی۔ ۱۸۷۹ء میں پہلی مرتبہ قوم کے ہاتھوں میں آئی تو سارے دیس میں ایک ہل چل مچ گئی۔ ایک طبقہ ایسا تھا جسے مسدس میں سرتاپا عیب ہی عیب نظر آئے۔ لعن طعن، اعتراضوں، نکتہ چینیوں اور خفگیوں کا وہ طوفان برپا ہوا، اور تنگ دل، تنگ نظر حضرات نے وہ شور مچایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس سیلاب میں مسدس کی ہستی خس و خاشاک طرح بہہ جائے گی۔ لیکن برخلاف اس کے بعض حلقوں میں اس کی بہت پُرجوش پذیرائی کی گئی اور یہ قوم کے لیے زندگی کا روح افزا پیام ثابت ہوئی۔ اُسے اس کی بدولت ایک ایسا راستہ نظر پڑا جس کو دل ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ مایوسی کے اندھیارے میں ایک نور کی کرن ثابت ہوئی۔ اُس نے دلوں پر گہرا اثر کیا۔ بات دل سے نکلی تھی سیدھی دل میں جاکر بیٹھی۔ مخالفت کے خس و خاشاک نے طوفان کا سا زور باندھا لیکن تھوڑے سے عرصے میں یہ طوفان جس کی حیثیت سمندر کے اوپر جھاگ کی سی تھی، بیٹھ گیا اور حقیقت کا اعتراف کیا جانے لگا۔ عورت مرد، چھوٹے بڑے، امیر غریب، عالم، جاہل، خاص و عام سب اسے پڑھتے اور سر دُھنتے اور اپنی حالت پر آنسو بہاتے۔ میلادوں میں اس کے نعتیہ بند پڑھے جاتے تو مجلس جھوم اُٹھتی۔ واعظ اس کی اخلاقی تعلیم سے اپنے وعظ میں اثر پیدا کرتے۔ قومی لیڈر قوم کو اصلاح و ترقی کا جوش دلانے کے لیے اس کے بند پڑھتے۔ سماع کی محفلوں تک میں مسدس پڑھی جاتی اور راگ و راگنی کے شیدا حضرات کچھ دیر کے لیے من کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آجاتے اور اپنی حالت پر آنسو بہانے لگتے۔ ایک طرف وہ صاحبِ ذوق حضرات کے لیے سرمایۂ ادب بنی تو دوسری طرف مدرسوں میں بچّوں کے نصاب میں داخل کی گئی اور نئی نسل کی تعلیم میں اُس سے مدد لی جانے لگی۔ چنانچہ اس "روکھی پھیکی" نظم نے تھوڑے ہی عرصے میں قبولیت کا وہ درجہ حاصل کرلیا جو اس زبان کی اور غالباً کسی اور ملکی زبان کی کسی دوسری تصنیف کو

آج تک حاصل نہ ہوا تھا۔

حالیؔ نے جو "ابالی کھچڑی اور بے مزا سالن" اہلِ ذوق کے سامنے پیش کیا تھا اُس کی اس درجہ قبولیت دیکھ کر وہ خود بھی حیران رہ گئے اور اس کی برکت سے قوم میں زندگی اور ترقی کے جو اثر نظر آئے اُس نے شاعر کے دل میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا۔ قوم میں بیداری کے آثار دیکھ کر، امید کی اک نئی کرن حالیؔ کے سامنے چمکی اور انہوں نے کچھ اور بند مسدس میں اضافہ کئے جن میں قوم کو نا امیدی کے بھنور سے نکال کر امید کا دامن تھامنے، اپنے چھپے ہوئے جوہروں کو پرکھنے اور سعی و عمل کی راہ میں گامزن ہونے کی تلقین کی۔ ان کی شاعری گویا امید کا ایک مینارہ تھی جو یاس و بے دلی کے سمندر میں ڈوبتے ہوؤں کی ہمت بندھا رہی تھی۔

آیئے اب ذرا مسدس کے موضوع پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالیں۔ شروع میں مسلمان قوم کی موجودہ ابتر حالت کا ایک مجمل اور مختصر سا خاکہ کھینچنے کے بعد شاعر ان کو عرب کی طرف لے جاتا ہے جو ان کی تہذیب کا گہوارہ تھا۔ اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں عرب کی کیا حالت تھی؟ پھر محمدؐ عربی صلعم کے ظہور اور ان کی تعلیم کا بڑے دلکش اور بڑے پُر اثر انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔ مگر عقیدت کی فراوانی میں بھی دیانت اور حقیقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ پھر دکھاتا ہے کہ کس طرح ہادیٔ برحق کی تعلیم نے ایک مردہ قوم میں نئی روح پھونک دی اور اُس کی بدولت اُسے دنیا میں کیسی عزت اور عظمت نصیب ہوئی۔ "اس حصّے کی اصلی اہمیت یہ ہے کہ اُس میں حالیؔ نے اسلام کی تعلیم کا ایک ایسا صحیح اور سچا نقشہ کھینچا ہے جو بڑے بڑے عالم دین بھی نہیں کر سکے تھے۔" اسلام[1] کی تعلیم کے رُخِ روشن پر زمانے کے

---

[1] مسدس کی مصلحانہ شان   از خواجہ غلام السیدین

تعصب، مخالفوں کی غلط بیانی اور خود مسلمانوں کی بے راہ روی کی وجہ سے جو پردہ پڑ گیا تھا، حالی نے اُس پردے کو اٹھا کر دکھا دیا کہ اسلام ایک مذہب امن ہے جو دنیا میں سلوک اور محبت کی حکومت قائم کرنے آیا تھا۔ اسلام کا مقصد قوموں اور جماعتوں کا اختلاف اور تعصب کو مٹانا اور ان میں ایک عالم گیر اخوت قائم کرنا تھا۔ اس نے فقیری میں خودداری اور جد وجہد اور ثروت میں فیاضی، خدا ترسی، اور خوش شناسی سکھائی تھی۔ اُس نے علم وحکمت کو مومن کی کھوئی ہوئی پونجی سے تعبیر کیا تھا۔ اسی کی برکت سے مسلمانوں نے دنیائے فکر وعمل کو مسخر کر لیا تھا۔ .....“

لیکن بعد میں جب اُمت اپنے ہادی کی تعلیم کو بھول بیٹھی تو ؂

گیا چھوٹ سر رشتہ دین ہدیٰ کا ــــــ یہ گدلا ہوا جب کہ چشمہ صفا کا
تو پورا ہوا عہد تھا جو خدا کا ــــــ رہا سر پہ باقی نہ سایہ ہما کا
کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک
وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک

اور پھر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں جو پھوڑا مدت سے ٹیسیں مار رہا تھا پھوٹ بہا ہے۔ اُس نے قوم کی بدحالی، پستی، اخلاقی گراوٹ، جہالت اور بے عملی کا وہ عبرت انگیز منظر دکھایا کہ ہر حساس دل شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے اور اپنی اور قوم کی حالت پر شاعر کے ساتھ خون کے آنسو روتا نظر آتا ہے۔ قوم کے ہر ہر طبقے اور ہر ہر فرقے کی حالت کی مکمل تصویر آنکھوں میں پھرنے لگتی ہے اور ہر ایک اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر شرم سے سر جھکا لیتا ہے۔ آخر میں ایک صاحب نظر فن کار کی طرح ناامیدی میں اُمید کی کرن چمکا کر، محنت کی عظمت اور عمل کی برکت بتا کر، علم وعمل کے میدان میں قدم بڑھانے کا حوصلہ بندھا کر، بارگاہِ الٰہی میں قوم کے لئے دعا کرتے ہوئے شاعر رخصت ہو جاتا ہے۔

مسدس کی اس درجہ قبولیت کی ایک بڑی وجہ تو اس کی حقیقت نگاری، صداقت خلوص اور وہ درد و سوز ہے جو اُس کے ہر ہر شعر میں جاری و ساری ہے۔ ایک دوسری وجہ زبان و بیان کی سادگی، روانی، شیرینی اور وسعت بھی ہے۔ حالیؔ کا پیام قوم کے کسی ایک طبقے یا فرقے کے نام نہ تھا اس لئے وہ اسے کسی خاص اصطلاحی اور مشکل زبان میں ادا نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو تو اپنی پوری قوم کو اپنا پیام پہنچانا تھا خواہ وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس لئے انہوں نے وہ زبان استعمال کی جسے ہر کس ناکس آسانی سے سمجھ سکے۔ "بیان کی سادگی اور صفائی، زبان کی سلاست اور نرمی اور گھلاوٹ حالیؔ کا حصہ ہے۔ انہوں نے وہ الفاظ اور محاورے جو ادب میں متروک اور گھٹیا سمجھے جاتے تھے لیکن روزمرہ کی زبان میں انہیں قبولیت حاصل تھی بے تکلف استعمال کئے اور اس خوبی سے کہ جو لفظ جہاں بٹھا دیا گیا وہاں نگینے کی طرح جڑ گیا ہے۔ بقول مولوی عبدالحق کے "زبان کی حقیقی فصاحت دیکھنی ہو تو اس نظم (مسدس) میں دیکھنی چاہیئے جس میں مختلف قسم کے مضامین و واقعات نہایت بے تکلفی اور روانی سے ادا کئے گئے ہیں۔ اس پر بیان کا تسلسل اور مضامین کی بلندی قابلِ دید ہے۔ نظم میں الفاظ کا صحیح استعمال جس طرح مولانا نے کیا ہے اور زبان کو اخلاقی اور حکیمانہ خیالات ادا کرنے کے لئے جس طرح وہ کام میں لائے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔ بہت سے الفاظ جو دربارِ فصاحت میں بار نہیں پا سکتے تھے اور جن کے جوہر ہم پر اب تک نہیں کھلے تھے مولانا نے اُن کی قدر کی اور انہیں ایسے ٹھکانے بٹھایا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں معمولی اور سادہ الفاظ جادو سا پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حالیؔ نے زبان کو وسعت نہیں دی بلکہ ایک نئی زبان پیدا کی ہے ......"

آج سے ستر سال پہلے مسدس حالیؔ پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔ اُس وقت سے

آج تک اُس کا جو اخلاقی اور اصلاحی اثر پڑا ہے اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ آئندہ بھی جب تک انسان میں اچھے اور بُرے نیکی اور بدی میں تمیز کی اور پستی سے بلندی کی طرف جانے کی صلاحیت موجود ہے اَدب میں مسدس کا مقام محفوظ ہے۔ جہاں ایک طرف اُس کو قبولِ عام اور بقائے دوام کا درجہ حاصل ہے وہاں اس نے ہزاروں اہلِ دل، اہلِ قلم، اہلِ نظر اور صاحب ذوق لوگوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ اب تک اُس کے سینکڑوں ایڈیشن اُردو زبان میں چھپے ہیں اور شاید ہی کوئی ہندوستانی جاننے والا ایسا ہو جس نے ساری مسدس یا اُس کا کچھ نہ کچھ حصہ نہ پڑھا یا نہ سُنا ہو۔ ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں مسدس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور دوسرے ملکوں کو لوگ جو اردو زبان اور اردو ادب سے واقف ہیں اس کے رتبہ شناس ہیں۔ اس ضمن میں وہ قصہ قابلِ ذکر ہے جو مسدس کے بارے میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے بیان کیا تھا۔

مولانا سندھی سالہا سال روس میں رہے تھے اور روسی زبان اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے زمانہ قیام میں روس میں ایک نمائش ہو رہی تھی جہاں ایک بہت بڑے ہال میں اس قسم کے تمام اقوال اور اشعار لکھ کر سجائے گئے تھے جن میں محنت مزدوری اور مزدوروں کی عظمت اور اہمیت ظاہر کی گئی تھی۔ مولانا نے جب اس نمائش کو دیکھا تو اپنے روسی دوستوں سے کہا کہ آپ کے ہاں تو اب چند سال سے یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ محنت قابلِ تعظیم ہے لیکن ہمارے دیس میں آج سے سو برس پہلے ایک ایسا شخص پیدا ہوا تھا جس نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور اپنے کلام میں اس خیال کو بہت زور اور جوش کے ساتھ بیان کیا ہے اور محنتی اور کامی لوگوں کو اشرف ترین انسان کا درجہ دیا ہے۔ لوگوں کو پہلے تو ان کی بات کا یقین ہی نہ آیا لیکن جب مولانا نے مسدس کے چند بندوں کا ترجمہ کر دا کے لوگوں کو دکھایا

تو انہیں بڑی حیرت ہوئی اور یہ اشعار اس درجہ پسند کیے گئے کہ اس تاریخی نمائش میں تمام اقوال و اشعار میں سب سے بلند اور باعزت جگہ حالی کے ان اشعار کو دی گئی ؂

یہ برکت ہے دنیا میں محنت کی ساری جہاں دیکھیے فیض اسی کا ہے جاری
یہی ہے کلیدِ درِ فضلِ باری اسی پر ہے موقوف عزت تمہاری
اسی سے ہے قوموں کی یاں آبرو سب
اسی پر ہیں مغرور ہیں اور تو سب
گلستاں میں جوبن گل و یاسمن کا سماں زلفِ سنبل کی تاب و شکن کا
قدِ دل ربا سرو اور نارون کا رخِ جاں فزا لالہ و نسترن کا
غریبوں کی محنت کی ہے رنگ و بو سب
کمیروں کے خوں سے ہیں یہ تازہ رُو سب

مسدس حالی صرف اخلاقی اور اصلاحی نقطہ نظر ہی سے ایک بالکل جدید طرز کی چیز نہ تھی بلکہ حقیقت میں یہ ترقی پسند ادب اور نئی شاعری کا سنگ بنیاد تھی۔ جس تحریک کو ہم ترقی پسند تحریک کہتے ہیں دراصل آج سے ستر سال پہلے حالی نے اس کی ابتدا کی تھی۔ اگر آج ترقی پسند تحریک اشتراکیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ پون صدی پہلے بھی اس صورت میں یہ تحریک اُٹھائی جا سکتی تھی۔ حالی نے صرف ترقی کا راستہ نہیں دکھایا بلکہ دراصل ایک انقلاب کی بنا ڈالی۔ انھوں نے صرف شعر کی دنیا میں انقلاب پیدا نہیں کیا بلکہ شعر کے ذریعے انسانوں کے دماغوں اور ذہنوں میں بھی انقلاب کا بیج بویا۔ ہاں حالی تخریب کے ساتھ ساتھ تعمیر کا کام بھی کرنا چاہتے تھے۔ وہ فرسودہ عمارت کے پرانے مسالے سے ایک نئی اور پائیدار

عمارت بنانا چاہتے تھے۔ ہمارے ہاں بعض نقاد بڑی بے تکلفی اور "بے غوری" سے آج کے معیاروں پر انیسویں صدی کے شعر و ادب کو پرکھتے ہیں اور جب پرانی اصلاحی اور انقلابی چیزیں ان کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتیں تو بے تکلف ان کو کھوٹا سونا قرار دے دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں یہ سانچے، یہ معیار بہت بعد کے بنے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سماجی اور سیاسی ماحول کی پیداوار ہیں۔ حالی دراصل اپنے زمانے کے انقلابی، اور ترقی پسند تحریک کے بانی تھے۔ ہاں ان کا معیار جدا تھا چنانچہ ایک جگہ حالی کہتے ہیں "جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آجاتا ہے مگر پہیہ اور دُھرا بدستور باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیئے تھے مگر اسلوب بیان میں مطلق فرق نہیں آیا۔ جو تشبیہیں اور استعارے پہلے مدح، ہجا، غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے وہی اب توحید، مناجات، اخلاق اور موعظمت میں استعمال ہونے لگے۔ خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ متاخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات سے دست بردار ہو جائیں مگر ان کے طریقہ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے .... نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرز بیان میں قدما کے طرز بیان سے بہت دور نہ جا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انہیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں ......" اس لیے حالی نے معنی کی نئی شراب کو بھی پرانی بوتلوں یا ان سے ملتے جلتے پیمانوں میں پیش کیا اور اس طرح قبولیت کی راہ میں غیر ضروری الجھنیں نہیں پیدا کیں۔

مسدس میں بعض مقامات اپنی جگہ اتنے پُر اثر، دلکش اور فنی اعتبار سے

لاجواب ہیں کہ وہ اُردو ادب کے لئے ہمیشہ سرمایۂ افتخار رہیں گے۔ پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰؐ کی نعت میں شاعروں نے گزشتہ چودہ صدیوں میں کیا کچھ نہیں کہا! لیکن مسدس میں جو چند نعتیہ بند ہیں وہ ایک طرف عقیدت اور ارادت کی اور دوسری طرف حقیقت اور صداقت کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتے ہیں۔

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت　　بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت　　چلے آتے جس کی دیتے بشارت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحاؑ

ہوئے محو عالم سے آثارِ ظلمت　　کہ طالع ہوا ماہِ برجِ سعادت
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدت　　کہ تھا ابر میں ماہتابِ رسالتؐ
یہ چالیسویں سال لطفِ خدا سے
کیا چاند نے کھیت غارِ حرا سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا　　بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا　　قبائل کا شیر و شکر کرنے والا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا　　کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اُس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

مسلمانوں کی گذشتہ عروج کی تصویر دکھاتے ہیں تو کلام میں مردانہ جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے اور فصاحت کے دریا بہنے لگتے ہیں ؂

نہیں اس طبق پر کوئی برِّ اعظم
نہ ہوں جس میں ان کی عماراتِ محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، دیلم
بناؤں سے ہے ان کی معمور عالم
سرِ کوہ آدم سے تا کوہِ بیضا
جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے ان کا

ہوا اندلس ان سے گلزار یکسر
جہاں ان کے آثار باقی ہیں اکثر
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر
یہ ہے بیت حمرا کی گویا زباں پر
کہ تھے آلِ عدنان سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمیں پر نشانی

کوئی قرطبے کے کھنڈر جا کے دیکھے
مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے
خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے
جلال ان کا کھنڈروں میں یوں ہے چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

اور اسلام کے باغ ویراں کا نقشہ دیکھیے تو دل ہل جاتا ہے ؂

پھر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر
جہاں خاک اُڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر
ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر
نہیں پھول و پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں زہر کا کام کرتا ہے باراں　　جہاں آکے دیتا ہے رو ابر نیساں
تردّد سے جو اور ہوتا ہے ویراں　　نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں
نہیں پھول دپھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

وہ دینِ حجازی کا بیباک بیڑا　　نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہنچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا　　نہ عماں میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا
کئے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

اور جب اپنے دور کی شاعری کا پول کھولنے پر آتے ہیں تو گویا دنیائے شعر سرنگوں ہو جاتی ہے ؎

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر　　عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں سراسر　　ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے مطف نظر علم و انشا ہمارا

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے　　عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے　　مقرر جہاں نیک و بد کی جزا ہے
گنہ گار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

مسلمانوں کی پستی کی تصویر دکھاتے وقت حالی کا قلم تلخ سے تلخ تر ہو جاتا ہے لیکن اس کا سب سے سخت حصہ وہ ہے جہاں وہ شاعروں کی ہجو کرتے ہیں" اس لئے کہ یہاں ملامت غیر نہیں ملامت نفس مقصود تھی۔ اس کے باوجود الفاظ کی سختی

سے قطع نظر کر لیجئے تو واقعات کے بیان میں یہاں بھی اصلیت سے انحراف نہ پائیے گا۔" مبالغہ جو شاعری کی جان سمجھا جاتا ہے حالیؔ کے ہاں بس آٹے میں نمک برابر ہی ہوتا ہے۔

اپنی قوم کا ایک ایک عیب عبرت ناک انداز سے دکھانے کے بعد کس درد سے کہتے ہیں ؎

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے — پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے — کوئی ان میں سوتا کوئی جاگتا ہے
جو سوتے ہیں وہ مست خواب گراں ہیں
جو بیدار ہیں ان پہ خندہ زناں ہیں

کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو — کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
برا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو — نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو
بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

بہت قافلے دیر سے جا رہے ہیں — بہت بوجھ بار اپنا لدوا رہے ہیں
بہت چل چلاؤ میں گھبرا رہے ہیں — بہت سے نہ چلنے سے پچتا رہے ہیں
مگر اک تمہیں ہو کہ سوتے ہو غافل
مبادا کہ غفلت میں کھوئی ہو منزل۔

امیروں کی تم سن چکے داستاں سب — چِتَن ہو چکے عالموں کے بیاں سب
شریفوں کی حالت ہے تم پر عیاں سب — بگڑنے کو بیٹھے ہیں تیاریاں سب
یہ بوسیدہ گھر اب گرا کا گرا ہے
ستوں مرکزِ ثقل سے ہٹ چکا ہے۔

یہاں ہر ترقی کی غایت یہی ہے ۔۔۔ سرانجام ہر قوم و ملت یہی ہے
سدا اسے زمانے کی عادت یہی ہے ۔۔۔ طلسم جہاں کی حقیقت یہی ہے

بہت یاں ہوئے خشک چشمے اُبل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر

وہی اک ہے جس کو دائم بقا ہے ۔۔۔ جہاں کی وراثت اُسی کو سزا ہے
سوا اس کے انجام سب کا فنا ہے ۔۔۔ نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے

مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب
غلام اور آزاد ہیں رفتنی سب

آخر میں دلوں کو جو یاس کے دریا میں ہچکولے کھا رہے تھے امید کا حسین چہرہ
دکھا کر پھر سے تازہ دم کر دیتے ہیں ۔

بس اے ناامیدی نہ یوں دل بجھا تو ۔۔۔ جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا ناامیدوں کو ڈھارس بندھا تو ۔۔۔ فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

تیرے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

بہت ڈوبتوں کو تیرایا ہے تو نے ۔۔۔ بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تو نے
اُکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تو نے ۔۔۔ اُجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے

بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے

قوی تجھ سے ہمت ہے پیر و جواں کی ۔۔۔ بندھی تجھ سے ڈھارس ہے خورد و کلاں کی
تجھی پر ہے بنیاد نظمِ جہاں کی ۔۔۔ نہ ہو تو، تو رونق نہ ہو اس مکاں کی

تگاپو ہے ہر مرحلے میں تجھی سے
رُوا رو ہے ہر قافلے میں تجھی سے

یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں ہے
عزیزوں کی غفلت وہی جوں کی توں ہے
جہالت وہی قوم کی رہ نموں ہے
تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہے
مگر اے امید اک سہارا ہے تیرا
کہ جلوہ یہ دنیا میں سارا ہے تیرا

نہیں قوم میں گرچہ کچھ جان باقی
نہ اُس میں وہ اسلام کی شان باقی
نہ وہ جاہ و حشمت کے سامان باقی
پر اس حال میں بھی ہے اک آن باقی
بگڑنے کا گو اُن کے وقت آ گیا ہے
مگر اس بگڑنے میں بھی اک ادا ہے

بہت ہیں ابھی جن میں غیرت ہے باقی
دلیری نہیں پر حمیت ہے باقی
فقیری میں بھی بوئے ثروت ہے باقی
تہی دست ہیں پر مروت ہے باقی
مٹے پر بھی پندارِ ہستی وہی ہے
مکاں گرم ہے آگ گو بجھ گئی ہے

یہ سچ ہے کہ ہے قوم میں قحطِ انساں
نہیں قوم کے پر سب افراد یکساں
سفال و خزف کے ہیں انبار گویاں
جواہر کے ٹکڑے بھی ہیں ان میں پنہاں
چھپے سنگ ریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ
ملے ریت میں ریزۂ زر بھی ہیں کچھ

جو چاہیں پلٹ دیں یہی سب کی کایا
کہ اک اک نے ملکوں کو ہے یاں جگایا
اکیلوں نے ہے قافلوں کو بچایا
جہازوں کو ہے زورقوں نے ترایا
یونہی کام دنیا کا چلتا رہا ہے
دیئے سے دیا یونہی جلتا رہا ہے

حوادث نے ان کو ڈرایا ہے کچھ کچھ
مصائب نے نیچا دکھایا ہے کچھ کچھ

ضرورت نے رستہ دکھایا ہے کچھ کچھ　　زمانے کے غل نے جگایا ہے کچھ کچھ
ذرا دست و بازو ہلانے لگے ہیں
وہ سوتے ہیں کچھ کلبلانے لگے ہیں

یہ مانا کہ کم ہم ہیں ہیں ایسے دانا　　جنہوں نے حقیقت کو ہے اپنی چھانا
تنزل کو ہے ٹھیک اپنے جانا　　کہیں ہم کہاں اور کہاں ہے زمانا
پہ اتنا زبانوں پہ ہے سب کے جاری
کہ حالت بُری آج کل ہے ہماری

ذرا پھر کے پیچھے وہ جب دیکھتے ہیں　　وہ اپنا حسب اور نسب دیکھتے ہیں
بزرگوں کا علم و ادب دیکھتے ہیں　　سرافرازئ جدّ و اَب دیکھتے ہیں
تو ہیں فخر سے وہ کبھی سر اُٹھاتے
کبھی ہیں ندامت سے گردن جھکاتے

اگر کچھ بھی باقی ہے یاروں میں ہمّت　　تو ان کا یہی افتخار اور ندامت
شگونِ سعادت ہے اور فالِ دولت　　کہ آتی ہے کچھ اس سے بوئے حمیّت
وہ کھو بیٹھے آخر کمائی بڑوں کی
بھلا دی جنہوں نے بڑائی بڑوں کی

اگر باخبر ہیں حقیقت سے اپنی　　تلف کی ہوئی اگلی عظمت سے اپنی
بلندی و پستی کی نسبت سے اپنی　　گذشتہ و آئندہ حالت سے اپنی
تو سمجھو کہ ہے پار کھیوا ہمارا
نہیں دور منجدھار سے کچھ کنارا

مسدس کے بارے میں رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے: "یہ ایک الہامی کتاب ہے۔ اس کو تاریخ ارتقائے ادب اردو میں ایک سنگِ نشان سمجھنا چاہیئے۔ یہ

ایک تارہ ہے جو اُردو کے افق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی" اور ساتھ ہی ان کو اس کا اعتراف بھی ہے کہ "اُن کے مخاطب اُن کے اہلِ مذہب ہی نہیں بلکہ کل اہلِ وطن ہیں ....."

یہ آخری ریمارک غور کے قابل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حالیؔ کے پیشِ نظر مسلمانوں کی حالتِ زار تھی اور ان کی اصلاح ان کا مقصدِ اول تھا۔ لیکن وہ ان کے عروج وزوال کی جو داستان پیش کرتے ہیں وہ تاریخِ عالم کا ایک روشن اور عبرت انگیز حصّہ ہے اور اس کا مطالعہ انسان کی تہذیبی میراث کا جزو ہے۔ جو صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ سب قوموں کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ قومی عروج وزوال کے جو اصول اور اسباب اس میں سمجھائے گئے ہیں ان کا اطلاق عام ہے۔ اس کے علاوہ جن قدروں کو انہوں نے پیش کیا ہے اور جس انداز سے پیش کیا ہے وہ بھی زماں ومکاں کی قید سے آزاد ہیں۔ محنت، اکلِ حلال، دیانت داری، اخوّت، انصاف، سماجی برابری، علم کا احترام، دولت اور نام ونسب کی بے جا پاسداری کے خطرے۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن کا سمجھنا ہر قوم کے لئے ضروری ہے۔ اگر ان کو کسی خاص قوم یا مذہب کی اصطلاحوں میں بیان کیا جائے (اور برخلاف اقبال کے حالیؔ کے یہاں تو اصطلاحیں بھی بہت کم ہیں اور ان کی شاعری کی زبان ایک عالم گیر زبان ہے) تو اس سے ان کی قدریں کم نہیں ہو جاتیں۔

حالی کی مثنویاں اور دوسری نظمیں

مسدس، حالی کی قومی شاعری کا سنگ بنیاد تھا۔ اب حالی سرسید کے مشن میں برابر کے شریک ہو گئے اور انہوں نے اپنی شاعری کو قومی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ قومی خدمت کا تصور حالی کے ذہن میں یہ تھا کہ سرسید کی تعلیمی تحریک کی تائید کر کے قوم کو تعلیم کی طرف توجہ دلائیں۔ جہالت کی تاریکی کو دور کریں اور لوگوں کو معاشرتی اور معاشی اصلاح کی ضرورت کا احساس دلائیں تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ قومی زندگی کی تشکیل اور ترقی اسی پر منحصر ہے کہ وہ زمانے کے تقاضے اور مطالبے کو سمجھیں اور اُس کا ساتھ دیں۔ اگر انہوں نے اب بھی قدامت پرستی نہ چھوڑی، پرانی روایات کی پابندی پر اڑے رہے اور نئی تحریکوں کی مخالفت اور اُن سے نفرت کرتے رہے تو اُن کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔

اس سلسلے میں حالی نے بہت سی نظمیں اور مثنویاں لکھیں جن میں سے بعض بہت مشہور ہوئیں۔ ان سب کی تہہ میں یہی جذبہ اور یہی روح کارفرما ہے۔ اب اُن کی شاعری ارادی طور پر بامقصد شاعری بن گئی اور گو اس پر اُن لوگوں نے بہت اعتراض کیے جو آرٹ برائے آرٹ کے قائل تھے۔ لیکن حالی کو اپنے کام سے کام تھا۔ اور زمانے نے ثابت کر دیا کہ انہوں نے جو راستہ اپنے لئے اختیار کیا وہی صحیح اور سیدھا راستہ تھا اور ان کے مخالفین ایک فرسودہ روایت کی بھول بھلیاں میں کھوئے ہوئے تھے۔

ایک ترکیب بند جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں پڑھا گیا تھا

اس کے کچھ شعروں سے ان کی اس جدید تحریک کے رُخ کا اندازہ ہوگا۔ مولانا حالیؔ نے اس نظم پر ایک نوٹ اپنے دیوان میں لکھا ہے۔ "اس نظم میں متوسط درجے کے لوگوں کی حالت کو فقرا اور اغنیا دونوں کی حالت سے بہتر بتایا گیا ہے۔ متوسطین سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے اپنی ذاتی کوشش اور سلف ہلپ سے دولت، عزت نیک نامی یا علم و فضل میں اپنی پہلی حالت سے ترقی کر کے اپنے ہمسروں میں امتیاز حاصل کیا ہو۔ ادنےٰ درجے سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی پست حالت سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے یا چاہتے ہیں مگر نہیں بڑھ سکتے۔ اعلےٰ درجے سے وہ لوگ مراد ہیں جو دولت و عزت کے لحاظ سے ایک ممتاز حالت میں پیدا ہوئے مگر اس حالت سے ترقی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اور نیز اس حالت پر قائم رہنے کی فکر اور اس سے تنزل کرنے کا کچھ انسداد نہیں کرتے۔"

شکر اس نعمت کا یارب کر سکے کیونکر زباں
تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں
نعمتیں اکثر ہمیں بعد از مشقت تو نے دیں
تاکہ تیری نعمتوں کی قدر ہو ہم پر عیاں
راحتیں اکثر میسر آئیں تکلیفوں کے بعد
تاکہ کھو بیٹھیں نہ ہم ان راحتوں کو رائیگاں

افلاس سے پناہ مانگتے ہیں ؎

الحذر اس فقر و ناداری سے سو بار الحذر
لومڑی جاتے ہیں بن جن کی بدولت شیرِ نر

اور پھر کہتے ہیں ؎

گو کہ بدتر فقر سے یا ربّ تھی کوئی بلا
تھا مگر ثروت میں اس سے بھی زیادہ شور و شر
فقر سے تو نے بچایا یہ بھی کم نعمت نہیں
پر نہ دی ثروت، سوا اس کے شکر کی طاقت نہیں
نشۂ دولت سے تھا پھر ہوش میں آنا محال
اس مئے مرد آزما کی تھی بہت مشکل سنبھال
نفسِ امّارہ اور اس پر چھیڑ مال و جاہ کی
ڈھیر ہے بارود کا دیجے پتنگا جس میں ڈال

باڑ پر تلوار کی چلنا نہیں شاق اس قدر   جس قدر ثروت میں ہو دشوار پاسِ اعتدال

گلشنِ دولت کے ہوں انگور میٹھے بھی اگر   دیکھ اے روباہِ نفسِ دوں! حذر ان سے حذر

اور پھر اُس درمیانی زندگی کی جنت کی جھلک دیکھئے جو محنتی لوگ اپنے قوتِ بازو سے حاصل کرتے ہیں ؎

ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی   فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنے سے بری

رکھتے ہیں فقر و غنا میں جو کہ حالت بین بین   ہیں حسد اور کبر کے امراضِ مہلک سے بُری

لذتِ فقر و غنا دونوں سے ہیں وہ آشنا   اغنیا میں ہیں فقیر اور ہیں فقیروں میں غنی

جو گذرتی ہے گدا پر اُس سے ہیں وہ باخبر   کیونکہ حالت گاہ گاہ ان پر بھی گذری ہے یہی

امتحاں دولت کے بھی ہیں کچھ نہ کچھ جھیلے ہوئے   کیونکہ ہے ہر گھونٹ میں اس مے کے بدمستی وہی

اس لئے جب دیکھتے ہیں عسرتِ ابنائے جنس   جوشِ ہمدردی سے بے کل ان کا ہو جاتا ہے جی

اور نہیں کرتے زبانِ طعن، بے دردی سے وا   جب کہ سنتے ہیں کسی منعم کی از خود رفتگی

اور اب اُن لوگوں کا مقام دیکھیے جن کو نہ دولت و ثروت نے مغرور اور بجیس کیا ہے نہ انتہائے افلاس نے بے کار اور پامال ؎

دل توانا اور قوی یاروں کی ہمت ان سے ہے   منتظم ہر قوم و ملت کی جماعت ان سے ہے

مشکلیں اکثر انہیں سے قوم کی ہوتی ہیں حل   بھائیوں کے بازوؤں میں زور طاقت ان سے ہے

ہاتھ میں انکے ہیں، جتنے عقل و دانش کے ہیں کام   عقل و دانش میں ہے جن ملکوں کی شہرت ان سے ہے

یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یاں   رونقِ بازارِ جنسِ علم و حکمت، ان سے ہے

پاؤ گے ان میں طبیب، ان میں ادیب، ان میں خطیب   ہے اگر انساں کو حیواں پر فضیلت، ان سے ہے

کرتے ہیں اخلاق ادنےٰ اور اعلےٰ ان سے اخذ   آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت ان سے ہے

پھونکتے ہیں روحِ قومیت یہی افراد میں
ہے جہاں قوموں میں یکرنگی و وحدت، ان سے ہے

اور پھر انہیں خطاب کر کے

قوم کو ہی آس جس سے، وہ جماعت ہی یہی
جس سے جان آتی ہو مردوں میں وہ طاقت ہے یہی

اتفاقِ قوم ہی اقبال و دولت کی دلیل
رائی کو کرتی ہی جو پربت، وہ قوت ہے یہی

قوم کی خدمت میں مضمر ہی ربوبیت کی شان
جو کہ مخدوم بناتی ہے خادم کو وہ خدمت ہی یہی

قوم کی ذلّت کو سمجھیں ذلّت اپنی، سب عزیز
ملک میں عزّت سے اب رہنے کی صورت ہی یہی

ایک دوسری نظم جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں اجلاس میں پڑھی گئی۔
اس سے بھی زیادہ پر اثر ہے اور شاعری کے لحاظ سے بھی زیادہ بلند ہے

یہ خاک آج جس پر ہیں جمع اہلِ آرا
یاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا

اس باغ میں بہاریں جو جو گزر چکی ہیں
آنکھوں کے روبرو ہے گویا سماں وہ سارا

اے خاکِ پاکِ دہلی، اے تختگاہِ شاہاں
پیشِ نظر ہیں تیرے سب اگلے ساز و ساماں

ہنگامے اس زمیں پر لاکھوں ہیں گرم ہر سو
پر کوئی جشنِ قومی آتا نہیں نظر یاں

شاہوں کے جشن تھے وہ یہ جشن قوم کا ہے
شوکت میں وہ بڑے تھے عظمت میں یہ بڑا ہے

دولت کے تھے وہ جلوے، ملت کا ہے یہ نقشہ
کاغذ کی تھیں وہ نادیں، بیڑا یہ نوح کا ہے

بے روح تھے وہ قالب، ہی اسمیں روحِ خوشی
موجِ سراب تھے وہ، یہ چشمۂ بقا ہے

میلے نہ وہ بچھڑتے روح ان میں گر یہ ہوتی
رہتا ہی آندھیوں میں روشن، یہ وہ دیا ہے

وہ دن گئے کہ ناز اں تھی قوم سلطنت پر
اب قوم کو خدا کا، یا اپنا آسرا ہے

قدر ایسی مجلسوں کی مدت میں جا کے ہوگی
اب تک ضرورتوں نے مضطر نہیں کیا ہے

گو سب جہاز والے خطرے سے بے خبر ہیں
پر رنگ ناخدا کا کچھ فق سا ہو رہا ہے

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا پر، روتا ہے ناخدا جب

گلشن میں فصلِ گل کے سب مٹ چکے نشاں ہیں
پر چین سے عنادل گلشن میں نغمہ خواں ہیں

طاؤس و کبک خوش خوش گلشن میں ہیں خراماں
اور بیٹھے ہاتھ ملتے گلچیں و باغباں ہیں

غفلت کی چھا رہی ہے کچھ قوم پر گھٹا سی
بے فکر و بے خبر ہیں بوڑھے ہیں یا جواں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانوں اٹھتی جوانیاں ہیں

دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو
ورنہ بگڑنے کے یاں آثار سب عیاں ہیں

جو اپنے ضعف کا کچھ کرتی نہیں تدارک
قومیں وہ چند روزہ دنیا میں میہماں ہیں

یہ غفلتیں مبادا کچھ روزِ بد دکھائیں
دھندلے سے کچھ نشاں ہیں ڈر ہے کہ مٹ جائیں

معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں سب سے زیادہ حالی کو عورتوں کی سماجی حالت کو بہتر بنانے اور انہیں وہ انسانی حقوق واپس دلانے کی فکر تھی جو مردوں کی خودغرضی نے ان سے چھین لئے تھے۔ اور جن سے جہالت کے سبب وہ خود بھی بے خبر تھیں۔ "چپ کی داد" میں انہوں نے عورتوں کی صفات اور خوبیوں کی جس جوش اور محبت و احترام کے ساتھ تعریف کی ہے اور ان کے ایثار و خدمت کو جس انداز سے سراہا ہے وہ اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہی ہے ؎

اے ماؤں بہنوں بیٹیوں دنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ایماں سلامت تم سے ہے

فطرت تمہاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے

تم آس ہو بیمار کی ڈھارس ہو تم لاچار کی
دولت ہو تم نادار کی عسرت میں عشرت تم سے ہے

اور ماں کی عظمت کا اقرار دیکھئے ؎

یقیں خبر اولاد کی مائیں نہ گر بچپن میں یہاں
خالی کبھی کا نسل سے آدم کی ہو جاتا جہاں
وہ دین اور دنیا کے مصلح جن کے وعظ و پند سے
ظلمت میں باطل کی ہوا، دنیا پہ نور حق عیاں
وہ علم اور حکمت کے بانی جن کی تحقیقات سے
ظاہر ہوئے عالم میں اسرار زمین و آسماں
کیا پھول پھل یہ سب انہیں کمزور پودوں کے نہ تھے؟
سینچا تھا ماؤں نے جنہیں خون جگر سے اپنے یہاں

اور پھر ان کے حقوق کی پائمالی اور علم کی روشنی سے محروم رہنے پر حالی کا حساس دل تڑپ اٹھتا ہے ؎

کی تم نے اس دار المحن میں جس تحمل سے بسر
زیبا ہے گر کہئے تمہیں فخر بنی نوع بشر

لیکن اس کے باوجود تمہاری قدر یہ ہوئی کہ ؎

جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
جو علم مردوں کے لئے سمجھا گیا آب حیات
ٹھیرا تمہارے حق میں وہ زہر ہلاہل سر بسر
آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

اور یہ بھی حالی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ؎

گزرے تھے جگ تم پر کہ ہمدردی نہ تھی تم سے کہیں
تھا منحرف تم سے فلک برگشتہ تھی تم سے زمیں
دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں

لیکن حالی نے یہ بھی محسوس کیا ؎

نوبت تمہاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے
انصاف نے دھندلی سی اک اپنی چمک دکھلائی ہے
گو ہے تمہارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا
پر حل ہر اک مشکل یونہی دنیا میں ہوتی آئی ہے
اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کے سدا
پر فتح جب پائی ہے سچائی ہی نے آخر پائی ہے

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستانی عورت کے حقوق کی حفاظت کی داد دیجئے۔ یاد رکھئے یہاں مسلمان عورت کا سوال نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی ہر عورت کی حمایت

پیشِ نظر ہے ۔ سب سے پہلی آواز جس شخص نے بلند کی اور اس کی سماجی مظلومی کا سب سے پہلے اعتراف کیا اور اس کی حمایت کا علم اٹھایا وہ حالی ہی تھے ۔

حالی کی بہت سی نظموں اور مثنویوں میں سب سے دل گداز اور اثر آفریں "مناجاتِ بیوہ" ہے جو زبان و بیان کی سادگی، روانی اور دلکشی کا ایک نادر مرقع ہے ۔ اس کا ترجمہ اکثر ہندوستانی زبانوں میں ہو چکا ہے ۔ اس نظم پر جو غالباً ۱۸۸۶ء یا ۱۸۸۷ء میں لکھی گئی تھی، حالی کو خود ناز تھا اور بجا ناز تھا ۔ اس نظم میں انہوں نے ایک کم سن بیوہ کی دردناک حالت کا نقشہ کھینچا ہے جو سماج اور رواج کے ظلموں کا شکار ہے ۔ اور اس انداز سے کھینچا ہے کہ دل کانپ اٹھتا ہے ۔ مولوی عبد الحق کی رائے ہے کہ "مناجاتِ بیوہ اور چپ کی داد ۔ دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں ملتی ۔ ان نظموں کے ایک ایک مصرع سے خلوص جوش، ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے ۔ یہ نظمیں نہیں دل و جگر کے ٹکڑے ہیں ۔ لکھنا تو بڑی بات ہے کوئی انہیں بے چشم نم پڑھ بھی نہیں سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

تاریخِ ادبِ اردو میں رام بابو سکسینہ نے بھی مناجاتِ بیوہ کی تعریف کچھ اسی انداز میں کی ہے "اس کو پڑھ کر یا سن کر دل پھٹ جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اس کو پڑھتے وقت اکثر شوہر دار عورتیں کہتی ہیں کہ کاش ہم بیوہ ہوتے تو اس سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" خیر یہ تو لطفِ بیان کے لیے ایک بات کہی گئی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ خود بیوہ اور سماج کی ستم رسیدہ عورتیں کیا سہاگنیں اور کنواری لڑکیاں بھی اسے پڑھ کر اپنے آنسو نہیں روک سکتیں ۔ بلکہ وہ مرد بھی جو ان مظالم کے بانی ہیں اس نظم کو پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ مجھے بعض وقت مناجاتِ بیوہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حالی باوجود مرد ہونے کے ایسا درد آشنا، ایسا احساس، اتنا نازک دل کہاں سے لائے جس نے کم سن بدنصیب بیوہ عورتوں

کے صحیح جذبات و احساسات کو اس طرح محسوس کیا جیسے یہ سب کچھ خود اس پر بیت چکا ہو۔ لیکن یہی تو اصلی شاعر کا کمال ہے کہ ہر ایک کی بیتی خود اُس پر گزرتی ہے اور تب ہی وہ ایسی زندہ جاوید چیز لکھ سکتا ہے جیسی مناجات بیوہ۔

اس نظم کا ہندوستان کی دس بارہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور سنسکرت میں بھی ترجمہ کی جا چکی ہے۔ یقیناً یہ نظم ہر ایک زبان میں اتنی ہی مقبول ہوئی ہو گی جتنی اُردو میں ہوئی۔ اس لیے کہ بیوہ عورت کی جو حالت اس میں دکھائی گئی ہے وہ ہندوستان کے ہر حصہ میں پائی جاتی ہے اور یہ دردناک تصویر ہر جگہ کی بیوہ عورت کی حالت کا آئینہ ہے۔

اس نظم کی زبان اور بیان کی سادگی ایک معجزہ ہے۔ اس کو پڑھ کر بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ آج سے ساٹھ برس پہلے حالی ہی نے "ہندوستانی" زبان کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اس کی سادہ، سہل، دل نشین اور رواں زبان میں ہندی کے سینکڑوں شیریں لفظ بے تکلف لیکن نہایت با محل، استعمال ہوئے ہیں۔ ایک مرتبہ مہاتما گاندھی نے مولوی عبدالحق سے پوچھا تھا کہ اُردو سیکھنے کے لئے میں کون سی کتاب پڑھوں تو مولوی صاحب نے ان سے کہا کہ حالی کی "مناجات بیوہ" کیوں کہ اگر بدقسمت ہندوستان کی کبھی کوئی مشترکہ زبان ہوئی تو وہی ہو گی جو اس نظم کی ہے۔ بے تعصبی کے ساتھ نظم کو پڑھیں تو اس دعوے میں مبالغہ نہیں معلوم ہو گا۔

اے میرے زور اور قدرت والے | حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دُکھیاری | دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن | جان پہ اپنی آپ اجیرن
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں | دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے | منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
تجھ پہ ہے روشن سب دُکھ دل کا | تجھ سے حقیقت اپنی کہوں گا

بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے — لینے کے یاں پڑ گئے دینے
خوشی میں بھی سکھ پاس نہ آیا — غم کے سوا کچھ راس نہ آیا
اک خوشی نے غم یہ دکھائے — ایک ہنسی نے گل یہ کھلائے
چین سے رہنے دیا نہ جی کو — کر دیا ملیا میٹ خوشی کو
رو نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک — اور روؤں تو روؤں کہاں تک
ایک کا کچھ جینا نہیں ہوتا — ایک نہ ہنستا، بھلا، نہ روتا
دن ہیں بھیانک رات ڈراؤنی — یوں گذری یہ ساری جوانی
کوئی نہیں دل کا بہلاوا — آ نہیں چکتا میرا بلاوا
آٹھ پہر کا ہے یہ جلاپا — کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا

سیلانی جب باغ میں آئے — پھول نہ تھے کھلنے ابھی پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں — جا سوئے سیلانی بن میں
پیت نہ تھی جب پایا پیتم — پیت ہوئی تو گنوایا پیتم

گھر برکھا اور پیا بدیسی — آئیو برکھا کہیں نہ ایسی
شرط سے پہلے بازی ہاری — بیاہ ہوا اور رہی کنواری
خیر سے ہے بچپن کا رنڈاپا — دور پڑا ہے ابھی بڑھاپا
عمر ہے منزل تک پہنچانی — کاٹنی ہے بھرپور جوانی

دین سے تیرے اے میرے مولا — سب ہیں نہال ادنےٰ اور اعلےٰ
سب کو ترے انعام تھے شامل — میں ہی نہ تھی انعام کے قابل

گر کچھ آتا بانٹ میں میری — سب کچھ تھا سرکار یہ تیری
پھروں سوچتی ہوں یہ جی میں — آئی تھی کیوں میں اس نگری میں
آن کے آخر میں نے کیا کیا — مجھ کو میری قسمت نے دیا کیا
رہی اکیلی بھری سبھا میں — پیاسی رہی بھری گنگا میں
آ کے خوشی سی چیز نہ پائی — جیسی آئی ویسی نہ آئی
چین گر اپنی بانٹ میں آتا — کیوں تو عورت ذات بناتا
کیوں پڑتے ہم غیر کے پالے — کیوں ہوتے اوروں کے حوالے
دُکھ میں نہیں یاں کوئی کسی کا — باپ نہ ماں بھائی نہ بھتیجا
سچ یہ کسی سائیں کی صدا تھی — سکھ سمپت کا ہر کوئی ساتھی

ریت کی سی دیوار ہے دنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یاں کا — ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے — اس نگری کی ریت یہی ہے
تیرے سوا یاں لے میرے مولا — کوئی رہا ہے اور نہ رہے گا
چاہتی ہوں اک تیری محبت — اور نہیں رکھتی کوئی حاجت
گھونٹ اک ایسا مجھ کو پلادے — تیرے سوا جو سب کو بھلادے
کوئی جگہ اس دل میں نہ پائے — یاد کوئی بھولے سے نہ آئے
دل میں لگن بس اپنی لگادے — سارے غم اپنے غم میں کھپادے

میں تو سمجھتی ہوں کہ اگر حالی نے مسدس نہ بھی لکھا ہوتا تو "مناجات بیوہ" ہی ان کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے کافی تھی۔ بحیثیت مجموعی مسدس کی عظمت اور اہمیت

یقیناً بہت زیادہ ہے لیکن بعض لحاظ سے میری نظر میں "مناجات" کا درجہ "مسدس" سے بھی زیادہ بلند ہے۔ ڈھائی سو اشعار کی اس نظم میں ایک شعر بھی تو ایسا نہیں جو شعر کی کسوٹی پر پورا نہ اترے یا جسے بھرتی کا کہا جا سکے۔ جو لفظ جہاں بٹھا دیا ہے انگوٹھی کے نگینے کی طرح جڑ گیا ہے۔ کوئی دوسرا لفظ اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔

حالی کی ان نظموں کے سلسلے میں "کلمۃ الحق" کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ قوم یا فرد کے اخلاقی اقدار کو بلند کرنے کے لئے سب سے زیادہ اور سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ اُس میں حق و صداقت کا احساس اور راست بیانی کی صفت پیدا کرنا ہے۔ اس دورِ زوال میں ہمارے دیس میں اس جنس کی جیسی ناقدری ہے۔ اور جھوٹ کی جیسی گرم بازاری وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ایسے زمانے میں حق گوئی کی بدولت جو کچھ سننا پڑتا ہے اُسے' اور حق گوئی کی جو اخلاقی اور عملی اہمیت ہے' دیکھیئے اُسے وہ کس خوبی کے ساتھ اس نظم میں دکھاتے ہیں ؎

اے راست گوئی' کیا قہر ہے تو؟	اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تو؟
شے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہوگی	حنظل میں ایسی تلخی نہ ہوگی
یاروں کو کرتی اغیار تو ہے	چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے
سقراط کو زہر تو نے دلایا	شبیر کو قتل تو نے کرایا
رخنے عرب میں تو نے نکالے	بدر و احد میں رن تو نے ڈالے
موسیٰ کو مدین تو نے بھگایا	احمدؐ سے مکہ تو نے چھڑایا
تیرے جلو میں رسوائیاں ہیں	سنگت تیری تنہائیاں ہیں

پھر بھی ؎

اے راست گوئی اے ابرِ رحمت	ہے اس چمن میں سب تیری برکت

تو بے کسوں کی یاور رہی ہے
تو گمرہوں کی رہبر رہی ہے

ہوتے رہے ہیں سب ملک و ملت
سرسبز تجھ سے نوبت بہ نوبت

گو تجھ میں تلخی حد سے سوا ہے
پر تری دارو صحت فزا ہے

ہر بول تیرا جوشِ غضب میں
ہے حق کی آواز راہِ طلب میں

اے کلمۂ حق اے سریزداں
جس وقت ہو تو پردے میں عریاں

ہوں تیرے جس دم انصار تھوڑے
دشمن بہت ہوں اور یار تھوڑے

عالم ہو تیرا جب ناشناسا
حالی کو رکھیو اپنا شناسا

رباعیاں

حالی نے بہت سی رباعیاں بھی کہی ہیں۔ جن کا درجہ انیس کی رباعیوں کے بعد سب سے بلند ہے۔ وہ ہر قسم کے مضمون کو رباعی میں بڑی خوبی اور روانی ساتھ بیان کر جاتے ہیں۔

توحید

طوفاں میں ہے جب جہاز چکر کھاتا
جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا

اسباب کا آسرا ہے جب اُٹھ جاتا
واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

نعت

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف
یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف

اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر
آبا کو بھی ہے تیری ابوت سے شرف

زندہ دلی

خوش رہتے ہیں دُکھ میں کامرانوں کی طرح
ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل ان کے ہیں ظرف ان کے، جو کرتے ہیں تیر
ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح

اصولِ کار

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو ایک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

علم

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے
سرچشمہ نعما وایادی تو ہے
آسائشِ دو جہاں ہے سایہ ہیں تیرے
دنیا کا وسیلہ دین کا ہادی تو ہے

عیش و عشرت

اے عیش و طرب تو نے جہاں راج کیا
سلطاں کو گدا، غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل
بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

عفو

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے بارِ خدا
مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے
جو لے سکے اور لے نہ بدی کا بدلا

تنزّل

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر اک جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

پیری

اب ضعف کے پنجے سے نکلنا معلوم
پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم
کھوئی ہوئی وہ چیز جس کا پانا ہی محال
آتا ہے وہ وقت جس کا ٹلنا معلوم

استغنا

دولت کی ہوس اصل گدائی ہی یہ
ساماں کی حرص بے نوائی ہی یہ
حاجت کم ہو تو ہے یہ شاہنشاہی
اور کچھ نہیں حاجت تو خدائی ہی یہ

حبّ وطن

یارو نہیں وقت آرام کا یہ
موقع ہے اخیر فکرِ انجام کا یہ
بس حبِّ وطن کا جپ چکے نام بہت
اب کام کرو کہ وقت ہے کام کا یہ

صلۂ خدمتِ قوم

کہدو جنہیں اصلاح کا ہے قوم کی چاؤ
طعنے جھیلو، برا سنو، گالیاں کھاؤ
یہ قوم کی خدمت کا صلہ ہے سرِ دست
گر اس پہ قناعت کا ارادہ ہے تو آؤ

شبِ ہجر

فرقت میں بشر کی رات کیوں کر گزرے؟
اک خستہ جگر کی رات کیوں کر گزرے؟
گزری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی
یہ چار پہر کی رات کیونکر گزرے

مرثیہ، قصیدہ، نعت

حالیؔ نے مرثیے اور قصیدے زیادہ نہیں کہے۔ مرثیے صرف تین کہے ہیں۔ غالبؔ کا مرثیہ، حکیم محمود خاں کا مرثیہ اور اپنے بھائی خواجہ امداد حسین کا مرثیہ۔

غالبؔ کا مرثیہ ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا۔ یہ مرثیہ اس محبت و عقیدت کا آئینہ ہے۔ جو حالیؔ کو غالبؔ سے تھی۔ اور ساتھ ہی کمالِ شاعری کا نمونہ، معلوم ہوتا ہے کہ دل کی کیفیت اور عقیدت شعروں میں ڈھل کر نکل آتی ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین کی رائے میں اس میں "غالبؔ کی سیرت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ اس سے بہتر تصویر ہماری نظم و نثر میں نہیں ملتی۔ یونانیوں کے ذہن میں جو تصوّر انسانیت کا تھا اُس کی جھلک انہیں غالبؔ کی ذات میں نظر آئی اور اُسے انہوں نے شعر کا جامہ پہنا کر شہرتِ دوام بخشی ؎

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا   معنیٔ لفظِ آدمیّت تھا

یہ شعر ایک قصیدے سے کم نہیں۔"

مرثیہ انیسؔ کا میدان ہے اور اس میں انہوں نے شہرتِ دوام حاصل کی ہے۔ اردو یا کسی اور زبان کا شاعر اس میدان میں ان کے پائے کو نہیں پہنچا لیکن ان کا موضوع سیّد الشہدا امام حسینؑ کی شہادت اور واقعاتِ کربلا کے دردناک اور عبرت آمیز مناظر ہیں۔ اور ان کا میدانِ سخن مسدس ہے۔ اگرچہ حالیؔ نے بھی قوم کا مرثیہ کہنے کے لئے بہترین صنف مسدس ہی کو سمجھا مگر غالبؔ کے مرثیے کے لئے انہوں نے مثنوی کی وہ بحر اختیار کی جو سب سے زیادہ پُراثر اور دلنشین ہے۔

مرثیئے کی اس قسم میں حالی کا کوئی مدِ مقابل آج تک پیدا نہیں ہوا ہے

بلبلِ ہند مرگیا ہیہات ۔۔۔ جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس ۔۔۔ پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج، شوخ مزاج ۔۔۔ رند اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضمون اُس کا ایک ٹھٹول ۔۔۔ سو تکلّف اور اُس کی سیدھی بات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا ۔۔۔ قلم اس کا تھا اور اُس کی دوات
اُس کے مرنے سے مرگئی دلّی ۔۔۔ خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم ۔۔۔ یاں اگر ذات تھی تو اُس کی ذات

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں ۔۔۔ کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سُنائیں شعر و غزل ۔۔۔ کس سے دادِ سخنوری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب ۔۔۔ کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں ۔۔۔ اہلِ میّت جنازہ ٹھیرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالبؔ کو ۔۔۔ سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ ترجیح ۔۔۔ اہلِ انصاف غور فرمائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے ۔۔۔ ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حسن و جمال کی صورت ۔۔۔ نظم غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر ۔۔۔ تعزیت اک ملال کی صورت
اُس کی تادیل سے بدلتی تھی ۔۔۔ رنگِ ہجراں، وصال کی صورت

چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے
انوری و کمال کی صورت

لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالبِ بے مثال کی صورت

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج

تھا زمانے میں ایک رنگین طبع
رخصتِ موسمِ بہار ہے آج

تھی ہر اک بات نیشتر جس کی
اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہاں آباد

شاعری کا کیا حق اس نے دیا
پر کوئی اُس کا حق گزار نہ تھا

بے صلہ مدح، شعر بے تحسیں
سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا

نذرِ سائل تھی جان تک لیکن
درخورِ ہمت اقتدار نہ تھا

خاکساروں سے خاکساری تھی
سربلندوں سے انکسار نہ تھا

لب پہ احباب سے بھی نہ تھا گلہ
دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا

بے ریائی تھی زُہد کے بدلے
زُہد اس کا اگر شعار نہ تھا

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا
معنیٔ لفظِ آدمیت تھا

ہند میں نام پائے گا اب کون
سکّہ اپنا جمائے گا اب کون

اس نے سب کو بھلا دیا دل سے
اس کو دل سے بھلائے گا اب کون

اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے
جا کے دلّی سے آئے گا اب کون

مر گیا قدردانِ فہمِ سخن
شعر ہم کو سُنائے گا اب کون

شعر ہیں نا تمام ہے حالیؔ غزل اس کی بنائے گا اب کون

یہ ایک حقیقت ہے کہ حالیؔ نے جہاں کہیں چھوٹی بحر استعمال کی ہے ان کے شعر بہت بلند ہو جاتے ہیں اور فصاحت و بلاغت کا دریا موجیں مارنے لگتا ہے۔ اپنے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کا جو مرثیہ انہوں نے کہا وہ لمبی بحر میں ہے اور باوجود اس کے کہ شاعر کا دل اپنے محبوب اور محسن بھائی کی وفات پر خون ہو رہا ہے اُس میں شاعری کی وہ فنی خوبیاں پیدا نہیں ہو سکیں جو غالبؔ کے مرثیئے میں ہیں۔ پھر بھی درد و اثر اس مرثیئے میں بھی کم نہیں ؎

کل سوگ میں بھائی کے اُسے دیکھ کے چُپ چپ
حالیؔ سے کہا ہم نے کہ اے بحرِ معانی

ہنسنا ہے، نہ رونا ہے، نہ بذلہ ہے نہ نوحہ
کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تو نے ہے ٹھانی

دنیا ہے یہ ایک دارِ فنا جس کا اثاثہ
سب خاک سے تا انجم و افلاک ہے فانی

ہو جائے گر انساں یونہی ہر رنج میں خاموش
کس طرح دلوں کے ہوں عیاں رازِ نہانی

اک آہ بھری سن کے یہ حالیؔ نے کہ جس سے
دل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی

فرمایا کہ موجوں سے بھنور کی نہیں آگاہ
ساحل پہ ہیں جو راہ سپرِ قاصی و دانی

حالیؔ ہی کو معلوم ہے حالیؔ کی حقیقت
مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی

پر بھائی ہو جس شخص کا حالیؔ کا سا بھائی
غم بھائی کا، مرجانے کی ہے دل کی نشانی

دل مردہ ہو حالیؔ کی طرح جس کا عزیزوں
کیا ڈھونڈتے ہو اُس کی طبیعت میں روانی

یہ چپ نہ لگائے کسی دشمن کو بھی اللہ
یہ چپ نہیں مرجانے کی ہے دل کے نشانی

بولیں گے بھی سو بار ہنسیں گے بھی جہاں میں
یہ ناؤ ہے ہر طرح ہمیں پار لگانی

پر آہ کلی وہ کہ جو مرجھا گئی دل کی
مشکل ہے وہ ہنس بول کے آپس میں کھلانی

حکیم محمود خاں کا مرثیہ حقیقت میں صرف ان کا مرثیہ نہیں بلکہ دِلّی کی عظمت اور بزرگی اس کے علم اور حکمت کا مرثیہ ہے۔ شاعر دیکھ رہا ہے کہ ایک ایک کر کے صاحبانِ علم و حکمت رخصت ہو رہے ہیں۔ دِلّی...... معدنِ جواہر دِلّی روز بروز تہی دست ہوتی جارہی ہے۔ اس کی چوٹ اُس کے دل پر پڑتی ہے۔

اے جہاں آباد اے اسلام کے دار العلوم
اے کہ تھی علم و ہنر کی تیری اک عالم میں دھوم
تھے ہُنرور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم
تھا افادہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

خاک سے اٹھے ہیں تیرے جیسے جیسے نکتہ ور
اک جہاں شیوہ بیانی سے ہے ان کی باخبر
راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر
سرو کو ہوگی نہ راس اتنی ہوائے غاتفر
حسنِ صورت میں اگر ضرب المثل نوشاد تھا
حسنِ معنی تیرا حصّہ اے جہاں آباد تھا

طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم
آن کر اُس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جب کہ تو آباد تھا دنیا میں اے باغِ ارم
بھرتے تھے تیرے اطبا بھی مسیحائی کا دم
ہند میں جاری تجھی سے طبِّ یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سی ارزانی ہوئی

لیکن آخر طبع دوراں کا ہی جیسا اقتضا
ہر ترقی کی ہے حد ہر ابتدا کی انتہا
جب کہ دورہ اپنا تو دنیا میں پورا کر چکا
وقت اے جانِ جہاں تیرا بھی آخر آ لگا
گردشِ افلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وار
تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر لگی کرنے بہار

تجھ پہ اے دار الخلافت انقلاب آنے لگے
غیب سے تجھ کو تباہی کے خطاب آنے لگے

طالع مشفق کے پیغامِ عتاب آنے لگے تیرہ بختی کے نظر یاروں کو خواب آنے لگے

دولت و اقبال کا بندھنے لگا رختِ سفر
تجھ سے اے دار العلوم اُٹھنے لگے علم و ہنر

چل دیئے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب مٹ گئی تیری طبابت چھُٹ گئے تیرے طبیب
جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب اس گلستاں سے نہ اُٹھی پھر صدائے عندلیب

جن کو کھو بیٹھے نظیر ان کا کہیں پایا نہ پھر
جو گیا اُس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیئے واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے
کچھ سخنور تھے سحر اپنا دکھا کر چل دیئے کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل دیے

ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گئی سیلِ فنا اُس کو بھی اے دلّی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی اُٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہاں آباد تو

اور آخر میں کس درد سے اپنی زندگی بھر کی مرثیہ خوانی کا نوحہ کرتے ہیں۔

سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی تھیں سخنور کیلئے چاروں طرف راہیں کھلی
داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی

گاہ غزلیں کہہ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو مجالِ نغمہ اس محفل میں کم راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم

نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا

ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

قصیدے حالی نے بہت کم کہے ہیں۔ تمام اصنافِ سخن میں سب سے کم دلچسپی انہیں اسی صنف سے معلوم ہوتی ہے۔ اپنے ایک خط میں لکھا ہے "مدحیہ قصیدے کا جس میں جھوٹ اور مبالغہ ہو لکھنا میرے لیے سخت مصیبت ہے" انہوں نے جو چند قصیدے کہے وہ بھی عام طور پر ناتمام چھوڑ دیے ہیں اور اُس میں بھی اپنے ممدوح کی تعریف میں مبالغے اور اُس کی طرف ناممکن صفات کو منسوب کرنے سے پرہیز کیا ہے۔ اور حتی الامکان صرف ان خوبیوں کا ذکر کیا ہے جو اس میں واقعاً موجود تھیں یا ان اچھے کاموں کا جو اُس نے کیے تھے۔ حالی کے قصائد کے بارے میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی رائے ہے کہ ان کے قصائد میں "برخلاف طریقہ سابق کے مادح کی ساری قابلیت ممدوح کی مدح اور محض لفظی شان و شکوہ میں صرف نہیں ہوتی بلکہ ممدوح اپنے اہم فرائض اور ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کیا جاتا ہے اور موقع موقع پر نصیحت و عبرت کی باتیں بھی اُسے سنائی جاتی ہیں" یہ صفت حالی نے اپنے روحانی گرو سعدی سے سیکھی تھی۔ سر آسماں جاں بہادر کی شان میں جن کی حالی واقعی دل سے عزت کرتے تھے اور ان کا بڑا احسان مانتے تھے انہوں نے دو تین قصیدے لکھے ہیں جن میں سے دو ناتمام ہیں۔ ان میں بھی ممدوح کی حقیقی صفات کے بیان سے آگے نہیں بڑھے اور انہیں ان کاموں کی طرف توجہ دلانے سے گریز نہیں کیا جو انہیں کرنے چاہئیں ے

خوشی ہے جس سے عبارت وہ ہے خوشی ان کی جنہوں نے خلق میں ذکر جمیل پھیلایا

جنہوں نے دین کے گرتے ستون کو تھاما
جنہوں نے علم کا بجھتا چراغ اُکسایا
سدا غریبوں کی امداد پر ہیں جو تیار
لیا سنبھال اُسے جس نے ہاتھ پکڑایا
نہ سمجھا آپ کو اک پاسبان سے بڑھ کر
انہوں نے لطفِ حکومت اسی میں کچھ پایا
نشاطِ عشرتِ جاوید کی ہو ان کو نوید
دل ایسا جن کو عنایت خدا نے فرمایا
سنا تھا کان سے جو ذکرِ خیر عہدِ سلف
سو آنکھ سے وہ وزیرِ دکن نے دکھلایا

حالی نے دو نعتیہ قصیدے لکھے ہیں جن میں قصیدے کا زورِ بیان اور اس کی روایتی شان زیادہ جھلکتی ہے۔ آں حضرت کی شان میں شعر لکھتے وقت ان کی زبان میں ایک خاص بلندی اور عظمت پیدا ہو جاتی ہے جو ان کی عام سادگی اور سلاست سے مختلف ہے ؎

گھر اُس کا موردِ قرآن و مہبطِ جبریل
در اُس کا کعبۂ مقصودِ انس و جاں کے لئے
سپہر گرمِ طواف اُس کی بارگاہ کے گرد
زمین سر بسجود اُس کے آستاں کے لئے
وہ گونہ گونہ مدارادہ بات بات میں مہر
کشایشِ گرہِ کینِ دشمناں کے لئے
گہ افتخار مقابل میں اہلِ نخوت کے
گہ انکسار و مُدارات میہماں کے لئے
کہیں ہلاک میں تاخیر قومِ سرکش کے
کہیں نماز میں تعجیل ناتواں کے لئے
صفائے قلب حسود ان کینہ خواہ کیساتھ
دعائے خیر بد اندیش و بدگماں کے لئے
شفیعِ خلق سراسر خدا کی رحمت ہے
بشارت امتِ عاصی و ناتواں کے لئے
حریفِ نعتِ پیمبر نہیں سخن حالی
کہاں سے لایئے اعجاز اس بیاں کیلئے

ایک دوسرے نعتیہ قصیدے کی تشبیب میں کچھ شعر فخریہ لکھے ہیں ؎

میں بھی ہوں حسنِ طبع پر مغرور
مجھ سے اٹھیں گے ان کے ناز ضرور

خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ | مجھ سے برتر ہے میری طبع غیور
جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں | اُس سے شکوہ نہیں کہ ہے مجبور
پہلے ہوگی کسی کو قدرِ سخن | اُٹھ گیا اب جہاں سے یہ دستور
سخنِ حق کی داد لوں کس سے | سُن چکا ہوں فسانۂ منصور
دُرِ یکتا ہوں اور ہوں بے آب | ماہِ کامل ہوں اور ہوں بے نور

اور پھر اس کے بعد سے

لوں ملائک سے دادِ حسنِ کلام | گر لکھوں نعتِ سرورِ جمہور
وہ شہنشاہ امتی جس کا | یاں گنہ گار اور واں مغفور
لبِ شیریں کلام سے اُس کے | دوست بھی شاد، غیر بھی مسرور
ہو سکے اُس کی خوبیوں کا شمار | نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور
اے ترا پایہ فہم سے برتر | اے ترا نام عرش پر مسطور
میں ترے در پہ سن کے آیا ہوں | نام تیرا شفیعِ زورِ نشور
دہائی ہے آستانِ والا سے | ہے بہت تنگ حالیؔ مہجور
جا لگے تیرے در پہ کشتیِ عمر | جب کروں بحرِ زندگی سے عبور
جیتے جی دل میں یاد ہو تیری | مرتے دم لب پہ ہو تیرا مذکور

حالیؔ کے قصیدوں میں ہمیں وہ زور اور حسنِ بیان اور فنی کمال نہیں ملتا جو ان کے دوسری قسم کی نظموں میں ہے۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس صنفِ کلام سے انہیں مناسبت ہی نہ تھی۔ یہاں تک کہ نعتیہ قصیدوں میں بھی وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ لیکن ان کا دوسرا نعتیہ کلام (جس میں مسدس کے چند بند اور رباعیاں اور ان کی مشہور نظم عرضِ حال شامل ہے) بہت زیادہ پُر جوش اور فنِ شاعری کی خوبیوں سے مزیّن ہے۔

نعتیہ قصیدوں کے علاوہ حالیؔ کی ایک دعا بھی بہت مشہور ہے۔ اس میں شاعر رحمتہ اللعلمین محمد مصطفٰےؐ سے فریاد کرتا ہے کہ اے رسول اللہ اپنی امّت کا حال دیکھیے جو پہلے تمام جہاں میں سب سے زیادہ باعزّت اور سرخرو، باعمل اور باہمّت قوم تھی وہ آج کس پستی اور ذلّت کی حالت میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے ہر ہر شعر شاعر کا دل چیر کر نکلا ہے ؎

دعا

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ
خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے

وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے

جس دین نے غیروں کے تھے دل آکے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے

جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی
اُس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے

جو دین کہ گودوں میں پلا تھا حکما کی
وہ عرصۂ تیغِ جہلا و سفہا ہے

ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی
دیں داروں میں پُر آب ہے باقی نہ صفا ہے

عالم ہے سو بے عقل ہے، جاہل ہے سو وحشی
منعم ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے

چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں
پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے

دولت ہے نہ عزّت نہ فضیلت نہ ہنر ہے
اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

ہے دین کی دولت سے بہا، علم سے رونق
بے دولت و علم اس میں نہ رونق نہ بہا ہے

جس قوم میں اور دین میں ہو علم نہ دولت
اُس قوم کی اور دین کی پانی پہ بنا ہے

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدّت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

بیڑا تھا نہ جو بادِ مخالف سے خبردار
جو چلتی ہے اب چلتی خلاف اُسکے ہوا ہے

جو قوم کہ مالک تھی علوم اور حکم کی
اب علم کا واں نام نہ حکمت کا پتہ ہے

بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہیں بنتی
ہے اس سے یہ ظاہر کہ یہی حکمِ قضا ہے

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانے سے نہ قسمت سے گِلہ ہے

دیکھے ہیں یہ دن اپنی ہی غفلت کی بدولت
سچ ہے کہ بُرے کام کا انجام بُرا ہے

فریاد ہے اے کشتیِ اُمّت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

اے چشمۂ رحمت بِاَبی اَنتَ وَ اُمّی
دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے

کر حق سے دعا اُمّتِ مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آکے گھرا ہے

اُمّت میں تیری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے ایک اِن میں سوا ہے

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبّت تری عترت کی وِلا ہے

کل دیکھیے پیش آئے غلاموں کو ترے کیا
اب تک تو ترے نام پہ ایک ایک فدا ہے

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پر آخر ہیں تمہارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے

تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں
پر فکر تیرے دین کی عزت کی سدا ہے

گر دین کو جوکھوں نہیں ذلّت سے ہماری
اُمّت تیری ہر حال میں راضی برضا ہے

عزّت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں
اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلّت میں مزا ہے

ہاں حالیِ گستاخ نہ بڑھ حدِ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گِلہ ہے

ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب
یاں جنبشِ لب خارج از آہنگ خطا ہے

حالؔی نے اپنی زندگی جن مقاصد کے لئے وقف کی تھی ان میں ادب اور شاعری کی اصلاح بھی تھی۔ حالؔی کے زمانے تک ادب و شاعری کا کام دماغی تفریح اور ذہنی مشغولیت تک محدود تھا اور اکثر فن کار "فن برائے فن" کے بے جان اور فرسودہ نظریئے کے پجاری تھے۔ سب سے پہلے حالؔی نے اسے محسوس کیا کہ یہ نظریہ ناقص ہی نہیں بلکہ غلط بھی ہے۔ ادب و شاعری زندگی سے بالکل بے تعلق ہو ہی نہیں سکتے۔ وہ اس کی کچھ نہ کچھ ترجمانی ضرور کرتے ہیں خواہ وہ ارادی طور پر نہ ہو۔ جو شاعر فرار کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور اپنا مشاہدہ محض داخلی زندگی تک محدود رکھتے ہیں وہ بھی حقیقت میں اپنی اور اپنے زمانے کی حالت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس دور میں اجتماعی زندگی کی کوئی حیثیت اور اہمیّت نہ تھی اور ہر ایک اپنی اپنی ذات میں مگن زمانے کی مصیبتوں کو من کی ایک دنیا بسا کر بھلانا چاہتا ہے۔ حالؔی نے شعر و ادب سے حقیقی زندگی کی ترجمانی کا کام لینے کے ساتھ ساتھ اُسے اصلاح کا ذریعہ بھی بنایا۔ "مقدمہ شعر و شاعری" لکھنے کی غرض یہی تھی کہ وہ شاعروں کو یہ حقیقت سمجھائیں کہ شعر کا اصلی مقام کیا ہے اور شاعر اُس سے کیا کام لے سکتا ہے۔ آج سے ساٹھ سینسٹھ برس پہلے جب لفظوں کی طلسم سازی اور بیان کی بلند پروازی اور خیالی دنیائیں بسانا ہی شاعری کا کمال سمجھا جاتا تھا، حالؔی کی زبان سے یہ انقلاب آفریں صدا بلند ہوئی تھی ؎

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دل گداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام　　ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں　　تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
حسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو　　آپے کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری　　قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو
اہلِ نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز　　جو بے بصر ہیں اُن سے نہ رکھ ساز باز تو
جو نابلد ہیں اُن کو بتا چور بن کے راہ　　گر چاہتا ہے خضر کی عمرِ دراز تو
عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا　　محمود جان آپ کو، گر ہے ایاز تو
اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا　　اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

ادب و شاعری کی جو نئی راہیں آج ہمارے سامنے کھلی نظر آتی ہیں۔ ملک و قوم کی خدمت، سماج کی تنقید و اصلاح، یہ حالی ہی کی کھولی ہوئی ہیں۔ ترقی پسند شاعری کا پودا جس کے اب پھلنے پھولنے کے دن آئے ہیں۔ حالی ہی کا لگایا ہوا ہے۔ ہاں اُس وقت ترقی پسندی کا تقاضا یہ تھا:۔

چپ چاپ اپنی سچ سے کئے جا دلوں میں گھر　　اونچا نہ کر ابھی علمِ امتیاز تو

مگر اسی کے ساتھ یہ عزم بھی تھا کہ اگر ساری دنیا مخالفت پر آمادہ ہو جائے تب بھی حقیقت نگاری کی سیدھی راہ سے قدم نہیں ہٹے گا۔

اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا　　اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

اور یہ بھی احساس تھا کہ نئی دنیا کی فتح کا طریقہ یہ ہے کہ:۔

کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل　　بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

اور یہ حقیقت بھی حالی سے چھپی ہوئی نہ تھی:۔

ہوتی ہے سچ کی قدر، پہ بے قدریوں کے بعد　　اس کے خلاف ہو تو سمجھ اُسکو شاذ تو

اور وہ کتنے ہی منکسر مزاج ہوں پر اس بات کو جانتے تھے کہ آج شعر کا

اصلی مقام سمجھنے والا اُن کے سوا اور کوئی نہیں :-

حالؔی کو تجھ پہ ناز ہے کر اس پہ ناز تو   جو قدرداں ہو اپنا، اُسے مغتنم سمجھ

حالؔی کے شعروادب میں ہمیں کئی ترقی پسند تحریکیں ملتی ہیں لیکن ایک چیز ہماری نظروں میں کھٹکتی ہے کہ حالؔی جو ادب و شاعری میں اس قدر ترقی پسند ہیں، ان کے ہاں سیاسی آزادی اور انقلاب کا کہیں ذکر نہیں ملتا اور نہ بظاہر انہیں اس سے کوئی دلچسپی نظر آتی ہے۔ لیکن اگر ہم حالؔی کے زمانے کی حالت اور اس دور کے لوگوں کی ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ لیں تو یہ تعجب دور ہو جاتا ہے۔ میں نے حالؔی کی سیرت کے سلسلے میں ان کے حبِ وطن کے ذکر میں اس کے متعلق کچھ بتایا بھی ہے۔

غدر سے پہلے اور غدر کے دوران میں ہمارا دیس بدامنی، انتشار اور مصیبت کے دور سے گزر رہا تھا۔ لوگ مطمئن زندگی اور امن و امان کو ترس گئے تھے۔ جب اس دور کے بعد ملک کی باگ ڈور انگریزی حکومت کے ہاتھ میں آگئی اور سارے دیس پر اُس کا تسلط جم گیا تو اُس نے رفتہ رفتہ اپنے انتظامی مصالح سے ملک میں امن قائم کیا اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ جو ابتری اور بدامنی پیدا ہوئی تھی، اس کے بعد، امن و سلامتی کا یہ زمانہ اس نسل کے لوگوں کو ایک بڑی نعمت معلوم ہوا۔ اگرچہ بعض لوگ بدیسی حکومت کے تسلط سے ناراض تھے۔ اور انگریزوں سے سخت تعصب رکھتے تھے لیکن عام طور پر سائنس کی نئی نئی ایجادوں، ریل، کارخانوں، تار، بجلی، ٹیلیفون وغیرہ کے کرشموں سے مرعوب تھے۔ حکومت مستحکم تھی، راستے محفوظ تھے، ضروریاتِ زندگی فراہم ہونے لگی تھیں۔ مغربی تعلیم نے بعض جماعتوں کے لئے معاش کے نئے راستے کھول

دیئے تھے اور ان سب باتوں کی وجہ سے سیاسی غلامی کے بجائے اکثر لوگوں کی توجہ ان چیزوں کی طرف مائل تھی۔

سرسید حالی اور ان کے دوسرے ہم عصر رہنماؤں، ادیبوں وغیرہ کو بھی انتشار اور ابتری کے بعد بدیسی حکومت کا دورِ امن مقابلتہً ایک برکت نظر آیا اور انہوں نے سمجھا کہ اب قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ حکومت کے ساتھ تعاون کرے اور نئے علوم اور سائنس سے منہ موڑنے کے بجائے مغربی علوم سے استفادہ کر کے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرے۔ تجارت وصنعت کے گر سیکھ کر بافراغت زندگی بسر کرنے کی تدبیر کرے۔ انہوں نے قوم کی فلاح وبہبود کو بدیسی حکومت کے تعاون سے وابستہ کر دیا تھا اور یہ امید باندھ لی تھی کہ وہ واقعاً ہندوستانیوں کی بھلائی اور ان کو ترقی کے راستے پر ڈالنا چاہتی ہے۔ یہ لوگ دیانت داری سے حکومت کی ابلہ فریبیوں کے دھوکے میں آ گئے تھے۔ سرسید تو آخر وقت تک اسی طلسم فریب میں گرفتار رہے۔ لیکن حالی کی زندگی کے آخر زمانے میں یہ طلسم ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا۔ بلقان اور طرابلس کی جنگوں نے یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ انگریز مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو کچل کر ختم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر حالی نے یہ بھی دیکھا کہ بدیسی حکومت کا اصل مقصد تجارت ہے۔ اور وہ اس ملک کو انگریزی مال کی منڈی بنانا چاہتی ہے۔ اس دیس کے باسیوں سے اُسے کوئی محبت یا ہمدردی نہیں۔ بلکہ وہ ملک میں تعصب اور نفاق پھیلا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتی ہے چنانچہ ان کی بعض نظموں میں اس احساس کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اور "کالے اور گورے کا میڈکل امتحان" "پولیٹیکل اسپیچیں" "تدبیرِ قیامِ سلطنت" وغیرہ میں انہوں نے ان جذبات کا اظہار کیا ہے۔

"تدبیرِ قیامِ سلطنت" میں انہوں نے حکومت کی سیانت کو بہت خوبی

سے بے نقاب کیا ہے :-

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح — واں پاؤں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس پہ بھی مشورہ دیتی — یہ حرفِ سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر — مانو اُسے، اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام کئے جاؤ وہ لیکن — جو بات سبک ہو اُسے منہ سے نہ نکالو

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا — دیکھ کے اُس کو یاد تمہارے آگئے سب احسان ہمیں

لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کا کلام کم ہے اور اُس میں وہ جوش اور زور نہیں جو ان کے دوسرے اصلاحی کلام میں پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اُس وقت تک خود قومی تحریک (جو کچھ عرصے پہلے شروع ہو چکی تھی) بے جان سی تھی اور اس میں وہ زور اور زندگی نہ تھی جو بعد میں مہاتما گاندھی نے اُسے بخشی۔ دوسرے حالؔی اس وقت تک بہت بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ اس حالت میں جوانی کا سا جوش لے کر کسی نئی تحریک میں شریک ہونا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ لیکن اُن کی طبیعت کی افتاد اور ان کے زندگی بھر کے کاموں کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ حالؔی اگر دس بیس برس اور زندہ رہتے اور وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتے جو ملک اور قوم کو بدیسی حکومت کی بدولت سہنا پڑا تو وہ یقیناً آزادی کی تحریک میں اتنے ہی جوش اور خلوص سے شریک ہوتے جیسے اصلاحی تحریک میں ہوئے۔

حالؔی کی شاعری کی فنی خصوصیات

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جس شاعر کا مقصد اپنا پیام زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پہنچانا ہو اس کو سادہ اور عام فہم زبان میں کہنے کی ضرورت ہو گی۔ اور جو شاعر زندگی کی حقیقی تصویر کھینچنے کا حوصلہ کرے گا اس کے لئے اصلیت اور حقیقت نگاری لازمی چیزیں ہیں لیکن اسی کے ساتھ شعر میں درد اور اثر اور حسن آفرینی بھی ناگزیر ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر شعر شعر نہیں بن سکتا۔

حالی ایک حقیقت نگار شاعر ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات اُس کی سادگی، اصلیت جوش، حقیقت پسندی، درد اور اثر ہیں۔ انہیں تخیّل کی انتہائی بلند پروازی، پیچیدہ استعارے اور دور از کار تشبیہوں کے استعمال اور رنگین بیانی اور طلسمی دنیاؤں کے بنانے سے دلچسپی نہیں۔ وہ نہ ان سے کام لیتے ہیں، نہ لینا چاہتے ہیں۔ لیکن اثر پیدا کرنے کے لئے دوسرے ذرائع وہ پوری قابلیت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ہر شاعر کا مقصد اپنے شعر سے سننے والوں کو متاثر کرنا ہوتا ہے۔ البتہ اس کی نوعیت میں فرق ضرور ہے۔ پرانے شاعر لوگوں پر حیرت و استعجاب کا اثر ڈالنا چاہتے تھے۔ اور شعر کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو مسحور کر دے اور وہ حیران ہو کر کہیں واہ کیا خوب کہا ہے! یعنی حاصل کلام تعریف کرانا تھا۔ لیکن حالؔی سامع کو مسحور کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے شعر کا مقصد تعریف کرانا نہیں بلکہ دل اور دماغ کو متاثر کرنا ہے۔ وہ اُسے دل فریب نہیں دل گداز

بنانے کے قائل ہیں۔

اے شعرِ دل فریب ہو تو، تو غم نہیں ۔۔۔ پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دل گداز تو

وہ یہ نہیں چاہتے کہ لوگ بے اختیار داد دینے لگیں بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ شعر سننے والے کے دل میں جا کر بیٹھ جائے...... لوگ اُسے سمجھیں اور محسوس کریں کہ کتنا ٹھیک کہا ہے کیسی سچی اور صحیح بات بیان کی ہے۔ اس لئے وہ اپنے شعر سے خطاب کر کے کہتے ہیں:۔

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ۔۔۔ ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حالیؔ کے کلام میں دل گدازی اور دل سوزی، سادگی اور دل نوازی کے ساتھ ساتھ "دل فریبی" نہ سہی، دل کشی ضرور ہے۔ ان کی دل سے نکلی ہوئی بات اہلِ دل کے دلوں میں اُتر جاتی ہے۔ رام بابو سکسینہ نے حالیؔ کے کلام کی خصوصیات کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا ہے "نیچر کی پیروی مبالغہ اور اغراق سے احتراز، سادگی اور صفائی، جذباتِ درد و اثر۔"

آل احمد سرور کہتے ہیں کہ "حالیؔ اپنے باغ کو پھولوں سے نہیں سجاتے بلکہ ان کے ہاں وہ رنگینی ہے جو خونِ جگر سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کا طرز رواں، متین اور سنجیدہ ہے...... ان کے ہاں بھی خامیاں ہیں، ان کا اخلاقی نقطہ نظر کہیں کہیں اس قدر نمایاں ہے کہ شاعری گھبرا کر پناہ مانگنے لگتی ہے.... ان میں وہ والہانہ کیفیت، وہ خود سپاری نہیں جو شاعری جان ہے، وہ تحیر نہیں جو غالبؔ یا سوداؔ یا اقبالؔ یا انشاءؔ تک میں موجود ہے مگر ان کے ہاں حیرت انگیز توازن، حیرت انگیز گہرائی اور حیرت انگیز اثر موجود ہے۔ وہ جدید شاعری کے پیغمبر اور اردو کے بہترین شعراء میں سے ہیں......"

حالیؔ کا کلام قوم کے نام ایک حیات بخش پیام تھا جو اُس کو پہنچا اور

اُس نے حسبِ استعداد قبول کیا۔ اور اب وہ اُردو زبان اور ہندوستانی تہذیب کی ایک عزیز دولت ہے جس سے اہلِ نظر اور اہلِ دل صدیوں استفادہ کرتے رہیں گے۔

حالیؔ کی نثر

رومانی شاعر جس کا میدان محض حسن و عشق کا طلسم باندھنا ہوتا ہے بالعموم اچھے نثر نگار نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ نثر تخیّل کی اُس رفعت، بیان کی اُس رنگینی اور جذبات کی اُس شدّت کی متحمل نہیں ہو سکتی جس کا اظہار شعر میں بڑی خوبی اور کمال کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس قسم کی نثر لکھی ضرور ہے مگر وہ ایک مصنوعی سی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن حالیؔ جیسا شاعر جس کی شاعری میں بھی زبان و بیان کی سادگی، وضاحت اور حقیقت پسندی کمال کو پہنچی ہوئی ہے نثر نگار بھی اتنا ہی کامیاب ہو سکتا ہے جتنا شاعر۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حالیؔ نے نثر کے میدان میں بھی ایک بیش بہا ادبی ورثہ چھوڑا ہے اور نثر نگاری میں ان کی شہرت شاعری سے کم نہیں۔

حالیؔ سے پہلے اکثر لکھنے والوں کے لئے اردو نثر کا موضوع بہت محدود تھا۔ اُس میں زیادہ تر تو قصّے اور داستانیں لکھی جاتی تھیں یا مذہبی کتابیں۔ حالیؔ نے بھی ابتدائی زمانے میں جو کتابیں نثر میں لکھیں وہ یا تو مذہبی ہیں یا نیم مذہبی۔ تریاقِ مسموم مولود شریف وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں۔ علمی خیالات کو اردو زبان میں ادا کرنے کی اس وقت تک کوئی قابلِ ذکر کوشش نہیں کی گئی تھی۔ جب علمی خیالات بیان کرنے کی ضرورت ہوتی تو اس کے لئے فارسی کو، جو اردو کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ زبان تھی، اختیار کیا جاتا تھا۔

سب سے پہلے سرسید نے زمانے کے بدلتے رنگ کو پہنچانا جس طرح

انہوں نے ملک کو انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھا اُسی طرح اُن کی دور بین نظر نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اب ہندوستان میں فارسی زبان کا کوئی مستقبل نہیں ہے. اس کے بجائے اُردو کو فروغ دے کر اس قابل بنانا چاہیئے کہ اُس میں علمی خیالات آسانی سے ادا ہو سکیں. اسی غرض سے انہوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس میں وہ خود اور اُن کے ہم خیال ساتھی ہر قسم کے سنجیدہ مسائل پر مضامین لکھ کر اردو زبان کی توسیع اور اُردو ادب کو مالا مال کرنے کی کوشش کرتے تھے. اُردو نثر نگاری کو نئی راہ پر ڈالنے کا فخر سر سید کے حصہ میں آیا. اس تحریک کو بڑھانے اور تکمیل تک پہنچانے میں جن لوگوں نے اُن کا ساتھ دیا ان میں حالی اور شبلی کا حصہ سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ہے ۔

حالی نے نثر نگاری کے میدان میں اپنے لئے دو خاص موضوع منتخب کیے. ادبی تنقید اور سیرت نگاری. ان دونوں میں ان کی نظر مورخ کی نہیں بلکہ نقاد کی نظر ہے. اس اجمال کی تفصیل مناسب معلوم ہوتی ہے.

علمی اور ادبی مسائل اور اشخاص کی سیرت پر دو طرح سے نظر ڈالی جا سکتی ہے. ایک تاریخی دوسرے تنقیدی اور اصولی. تاریخی اندازِ فکر تو یہ ہوتا ہے کہ جب کسی فرد یا کسی فن پر بحث کرے تو اُس کی ابتدا اور نشو و نما پر تفصیل سے روشنی ڈالے. اصولی اندازِ فکر یہ ہے کہ مصنف اشخاص پر یا ادب و شاعری وغیرہ پر اس نقطہ نظر سے غور کرے کہ ان کا اصلی مقصد کیا ہے اور وہ اس مقصد کو کس حد تک پورا کرتے ہیں. سماج اور ماحول کا ان پر کیا اثر پڑا اور انہوں نے اپنے سماج اور ماحول پر کیا اثر ڈالا.

حالی کا اندازِ فکر چونکہ اصولی اور تنقیدی ہے اس لئے انہوں نے دوسرا اندازِ بیان اختیار کیا ہے. وہ شعر کی تاریخی نشو و نما یا اشخاص کی سیرت کے ارتقا پر زیادہ

زور نہیں دیتے بلکہ دونوں کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ ان کا اپنے ماحول سے کیا تعلق تھا، انہوں نے ایک دوسرے کو کس حد تک متاثر کیا اور ان کے پیشِ نظر جو مقصد تھا اُسے وہ پورا کرتے ہیں یا نہیں؟

مورخ کے اسلوب بیان میں ادبی شگفتگی، دل آویزی اور روانی کی گنجایش زیادہ ہے۔ اس میں متانت اور وضاحت بھی ہوتی ہے لیکن ادبی رنگ غالب رہتا ہے جو عام طور پر پسندیدہ اور مقبول ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ حالی کی علمی تصانیف اتنی زیادہ مقبولِ عام نہ ہوئیں جتنی بعض دوسرے ادیبوں کی۔ حالی کے اور دوسرے انشاپردازوں کے اندازِ بیان میں یہی نمایاں فرق ہے۔ اگر وہاں ادبی چاشنی شگفتگی اور رنگینی ہے تو حالی کے ہاں صحت، وضاحتِ خیال، متانتِ بیان اور روانی پائی جاتی ہے۔ اکثر لوگوں کو ادبی اندازِ بیان زیادہ دلچسپ اور حالی کی تحریر خشک معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی کم سے کم ایک وجہ یہ ہے کہ ان کے مطالعہ کا مقصد محض دماغی تفریح یا وقت گذاری ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ محض اس غرض سے کتابیں پڑھتے ہیں وہ شگفتہ اور رنگین طرزِ بیان ہی کو پسند کریں گے۔ لیکن اگر مطالعے کا مقصد محض دماغی تفریح نہیں بلکہ کسی علمی مسئلہ کا حل کرنا، کسی ذہنی الجھن کو دور کرنا، کسی مسئلے کی حقیقت کو سمجھنا ہے تو اُس وقت حالی کی تحریر کی صحیح قدر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے پڑھنے والے کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو دماغی تفریح سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یعنی علمی ذوق کی تسکین اور تلاش میں کامیابی۔

حالی کی نثر میں وضاحت، متانت، استدلال، اعتدال اور توازن سموئے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں سلاست و روانی بھی پائی جاتی ہے لیکن اس کی شان دوسری ہے وہ روانی نہیں جو زبان تک محدود رہتی ہے یعنی پڑھتے ہوئے زبان کہیں نہ اٹکے بلکہ چٹخارے لیتی ہوئی چلی جائے بلکہ ان کے ہاں وہ معنوی روانی ہے جس میں دماغ کہیں نہیں

بھٹکتا، ذہن ٹھوکر نہیں کھاتا علمی مسائل ذہن میں صاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حالی کا مقصد الفاظ سے کھیلنا اور ان کی مدد سے ایک طلسمی دنیا بنا کر محض ذہن کو لبھانا اور مسحور کرنا نہیں۔ وہ پڑھنے والوں کو لوری دے کر سُلانا نہیں چاہتا بلکہ ان کے دل اور دماغ کی آنکھیں کھول کر ان کو سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ نتائج جو وہ پیش کرتا ہے انہیں اُن کا ذہن سوچ سمجھ کر قبول کرے۔

حالی کی نثر کے بارے میں بعض ادیبوں اور نقادوں کی رائے قابلِ غور ہے۔

پروفیسر گریہم بیلی کی (جنہوں نے اُردو زبان کے مطالعے اور خدمت میں اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا ہے) رائے حالی کی تحریر کے بارے میں یہ ہے کہ "حالی کی طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان مصنوعی آرائش اور تصنع سے مبرّا ہے۔ وہ کسی قدر پھیکا اور ناہموار ضرور ہے لیکن زور اور صحت سے معمور ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب وہ سائنٹفک موضوعات پر قلم فرسائی کرتے ہیں ....."

شیخ چاند مرحوم جنھوں نے حالی کی نثر کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اُس پر ایک مفصّل اور جامع مضمون لکھا تھا، کہتے ہیں۔

"حالی کی نثر کا اندازِ نہایت چچا تلا اور سنجیدہ و متین ہے۔ وہ خیال کے اعتبار سے زبان و بیان اختیار کرتے ہیں اور موثر و دل نشین انداز میں اپنے مافی الضمیر کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیالات کو سمجھنے میں سامع یا قاری کو کبھی دشواری پیش نہیں آتی اور وہ بے تکان مصنف کی پروازِ خیال ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ لفظی صنّاع اپنے قاری کو دھوکا دیتا ہے اور اپنے خیالات کی اُلجھن چھپا کر نمائشی اور ظاہری تماشے دکھاتا ہے۔ لیکن حالی اپنے پڑھنے والے کو وہ جلوے بے نقاب کر کے دکھاتے ہیں جس کو خود مصنّف کے تخیّل کی آنکھ دیکھتی ہے۔ وہ لفاظی اور بے جا تصنع کا کبھی شکار نہیں ہوتے بلکہ الفاظ کو اپنے خیالات کا تابع کر لیتے ہیں اور اُن کی

اس طرح کتر بیونت اور کاٹ چھانٹ کرتے ہیں کہ خیال کے جسم پر ٹھیک اترتے ہیں...... اس سلاست اور سادگی میں بھی انشاء و بیان کی خوبیاں زائل ہونے نہیں پاتیں بلکہ زورِ بیان اور فصاحتِ زبان کا رنگ زیادہ نمایاں اور جاذب ہوتا ہے۔ حالی خیال کو صفائی اور صحت کے ساتھ بیان کرنا انشاپردازی کا ہنر سمجھتے ہیں۔ علمی اور ادبی خیالات کی صحت اور باریکی شاعرانہ صناعی کو قبول نہیں کرتی۔ اس کا قدم آیا اور علمی مسائل کی نزاکت فنا ہو گئی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حالی کی طرزِ تحریر ادیبانہ اور انشاپردازانہ ہی نہیں بلکہ علمی اور خالص تنقیدی بھی ہے... حالی کی نثر کی ایک اور خصوصیت استدلال ہے۔ وہ اپنے خیالات کو نہایت مدلل طور پر پیش کرتے ہیں........ ان کی تمثیلیں اس قدر دلچسپ اور برمحل ہوتی ہیں کہ پڑھنے والا خیال کو بے تامل قبول کر لیتا ہے اور تمثیل کے نازک اور لطیف استعمال سے حظ اٹھاتا ہے......"

مہدی افادی تک نے جو بڑے خوش مذاق اور رنگین مزاج ادیب اور ایک اچھے نقاد تھے اور ہر قسم کی "خشک" چیزوں کے خلاف بے پناہ اور مبالغہ آمیز تنقید کرتے تھے اعتراف کیا ہے کہ سرسید کے بعد اگر کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو وہ بوڑھے حالی ہیں"

ڈاکٹر عابد حسین کی رائے ہے کہ "حالی کی نثر بھی اپنے رنگ میں ان کی نظم سے کم نہیں۔ اس میں پختگی اور سادگی کی وہی شان پائی جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سلاست درروانی میں نثر کبھی نظم کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خصوصاً وہ نثر جس میں علمی مضامین ادا کیے جائیں۔ پھر بھی ان کا اسلوبِ بیان اتنا سلجھا ہوا ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو پانی کر دیتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ علمی متانت اور وقار کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا....."

حالی ایک صاحبِ طرز ادیب تھے اور بقول آلِ احمد سرور کے "اُن کے جتنے رفیق اور ہم عصر تھے سب صاحبِ طرز تھے لیکن زندگی صرف حالی کے طرز کو نصیب ہوئی۔ باقی یا تو ختم ہو گئے یا ان کی کارفرمائی محدود ہو گئی۔ آزاد کی صناعی، نذیر احمد کا زورِ بیان، سرسید کی سادگی، شبلی کی رنگینی سب اپنی اپنی جگہ خوب ہیں لیکن آج نثر کا کیا رجحان ہے .... "حقیقت یہی ہے کہ حالی کا طرز ہی زندہ و پائندہ طرز تھا جسے اُردو کے ادیب اپنا سکتے تھے اور ایسے ہی طرز کو حیاتِ جاوید نصیب ہوتی ہے۔

حالی کے پاس الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جس میں وہ ہزاروں متروک الفاظ بھی موجود ہیں جنہیں عام طور پر ادیب و شاعر عامیانہ اور گھٹیا سمجھ کر ناقابلِ اعتنا سمجھتے تھے۔ لیکن حالی نے ان کا ایسا برمحل اور موزوں استعمال کیا ہے اور انہیں اس خوبی کے ساتھ بٹھایا ہے جیسے نگینے جڑ دیئے گئے ہوں۔ ان کی بدولت ان لفظوں نے ادب میں اپنی جگہ بنا لی۔ حالی کا ادبی مشرب بہت وسیع تھا۔ وہ اُردو کے خزانے کو بڑھانا چاہتے تھے اور اس حقیقت کو خوب جانتے تھے کہ اُردو زبان میں مختلف زبانوں کے الفاظ ہزاروں کی تعداد میں شامل ہیں جو سب اس میں مِل جُل کر اس کا جزو بدن ہو گئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہندی کے اور دوسری دیسی زبانوں کے الفاظ بے تکلف استعمال کئے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی رائے ہے کہ "انہوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اُردو ادب میں داخل کئے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کسی اُردو کے ادیب یا شاعر نے تو کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی حالی سے سیکھے ..... "

حاؔلی ہندی کے نرم، شیریں اور خوبصورت الفاظ سے بخوبی واقف تھے۔ اس لئے وہ انہیں بڑی خوبی اور صحت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُردو اور ہندی کو ایک دوسرے سے فطری مناسبت ہے۔ دونوں ایک ماں کی گود میں پرورش پائی ہوئی بہنیں ہیں۔ لکھنے والا اگر دونوں سے واقف ہو تو ایک کے لفظ دوسری میں بڑی خوبی سے کھپا سکتا ہے۔ چنانچہ حاؔلی نے ایسا ہی کیا۔ حاؔلی نے اپنی تحریر میں انگریزی لفظ بھی کافی تعداد میں استعمال کئے ہیں لیکن انگریزی سے اوّل تو وہ اچھی طرح واقف نہ تھے۔ دوسرے انگریزی ایک بدیسی اور اجنبی زبان تھی جس سے اردو کا وہ قریبی رشتہ نہیں ہو سکتا تھا جو ہندی سے ہے۔ اس لئے انہوں نے انگریزی کے جو لفظ اپنی نثر میں جا بجا استعمال کئے ہیں وہ اکثر بہت کھٹکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ پچھلے ستّر اسّی سال میں ہوتے ہوتے انگریزی کے بھی سینکڑوں لفظ اردو میں اس طرح کھپ گئے ہیں کہ اب نکالے نہیں نکل سکتے لیکن حاؔلی کے ہاں بعض ایسے غیر ضروری اور نامانوس الفاظ بھی ملتے ہیں جو کسی طرح اُردو میں نہیں کھپتے۔

حاؔلی کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ جس طرح اردو ہندی، فارسی، عربی کے ہزاروں لفظوں سے مالا مال ہے اسی طرح انگریزی سے بھی بہت کچھ لے گی۔ حاؔلی کا یہ خیال اس حد تک تو ضرور پورا ہوا کہ خیالات میں اُردو نے انگریزی سے بہت کچھ استفادہ کیا لیکن زبان میں صرف انہیں لفظوں کی کھپت ہو سکی جو یا تو چل چلا کر اُردو بن گئے ہیں یا بدیسی چیزوں کے نام اور ان کے متعلقات ہیں جو انگریزی حکومت کے ساتھ ملک میں آئیں۔ یا بعض اصطلاحیں ہیں جو ہمارے ہاں پہلے سے رائج نہ تھیں۔ اس سے زیادہ اُردو زبان انگریزی زبان سے نہ لے سکتی تھی اور نہ اُس نے لیا۔

حاؔلی نے نثر میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں لیکن ان کی چار کتابیں بہت

زیادہ مشہور اور مقبول ہوئی ہیں۔ حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید اور مقدمہ شعر و شاعری۔ ان کے علاوہ ایک اور کتاب "مجالس النساء" بھی اپنے زمانے میں بہت مقبول تھی۔ اس میں عورتوں کی اصلاح اور بچوں کی عمدہ تربیت کرنے کے اصول اور قاعدے قصّے کے پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ حالی کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے۔ اس میں مولوی نذیر احمد کے قصوں جیسی دلکشی اور فنی خوبی نہیں مگر اپنی جگہ بہت مفید اور خاصی دلچسپ کتاب ہے اور یہ اُس زمانے کی عورتوں میں بہت مقبول تھی۔

ان چار کتابوں میں تین سیرت نگاری سے تعلق رکھتی ہیں۔ حیاتِ سعدی ۱۸۸۱ء میں، یادگارِ غالب ۱۸۹۶ء میں اور حیاتِ جاوید ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئیں۔

سیرت نگاری میں حالی نے ایک نئی راہ اختیار کی جواب تک اُردو میں کسی نے نہ کی تھی اور وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ بعد میں اُردو سیرت نگاری اسی ڈگر پر چل پڑی۔ حالی محض ہیرو کی زندگی کے واقعات بیان کرنے اور اُس کی خوبیاں گِنانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اُس کی پوری زندگی اور کردار پر تبصرہ کرتے ہیں اور اُس کا تعلق اُس کے زمانے سے دکھاتے اور اُس کی اچھائیوں، برائیوں کو حق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ آلِ احمد سرور نے حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب کے بارے میں لکھا ہے "یہ دونوں سوانح عمریاں بھی ہیں اور تنقیدیں بھی..... زندگی کے حالات بیان کرنے پر حالی زیادہ زور نہیں دیتے........ ان کی توجہ شخصیت اور اُس کے کارنامے نمایاں کرنے پر رہتی ہے......" اس طرح منشی دیا نرائن نگم لکھتے ہیں "اُردو میں سب سے پہلے حالی نے نئے طرز کی سوانح عمریاں لکھیں۔ آپ کی حیاتِ سعدی اپنے قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے بعد غالب اور سرسید کی

سوانح عمریاں لکھ کر آپ نے ملک پر احسانِ عظیم کیا۔ یہ کتابیں اُردو کے لئے سرمایۂ ناز ہیں۔ اُن میں جس تفصیل اور مردم شناسی کے ساتھ فاضل مصنف نے اپنے ممدوحوں کے کل واقعات زندگی بلاکم و کاست قلم بند کر دیئے ہیں اور ان کی بدولت غالب اور سر سید دونوں کی روزمرہ زندگی، ان کے عادات و خصائل، بود و باش، مصائب و مشکلات اور خدمات و سیرت کی جیتی جاگتی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ دونوں کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے ذاتی واقفیت اور صحیح معلومات کی بنا پر لکھا گیا ہے۔ اس پر بھی کہیں ذاتی محبت اور دلی عقیدت واقعہ نگاری کے فرائض پر غالب نہیں آنے پائی۔" ڈاکٹر عابد حسین کا بھی یہی خیال ہے کہ "یہ تینوں کتابیں خصوصاً حیاتِ جاوید محض واقعات کی پوٹ اور تعریفوں کا پشتارہ نہیں بلکہ جدید طرز کی سوانح عمریوں کا نمونہ ہیں۔"

حیاتِ سعدی، حالی کی لکھی ہوئی سب سے پہلی سوانح حیات ہے۔ یوں تو ہندوستان میں صدیوں سے سعدی کا نام مشہور تھا اور ان کی گلستاں اور بوستاں سارے ہند میں بہت مقبول تھیں اور کوئی پڑھا لکھا ایسا نہ تھا جس نے سعدی کا نام نہ سنا ہو اور ان کی دلچسپ اور سبق آموز حکایتوں اور کہانیوں سے واقف اور ان کا مداح نہ ہو۔ سعدی کی جانے کتنی حکایتیں زبان زد تھیں۔ ان کے سینکڑوں اشعار اور مصرعے ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود سعدی کی ذاتی زندگی اور حالات سے عام طور پر ناواقفیت تھی۔ دراصل حالی ہی نے فارسی کے اس باکمال شاعر اور بے مثل ادیب کو اور اس کی زبردست شخصیت کو ہندوستانیوں سے متعارف کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر فارسی کے بہت سے بلند پایہ شاعروں میں سے حالی نے سوانح عمری لکھنے کے لئے سعدی ہی کا کیوں انتخاب کیا؟ اس کی ایک

وجہ تو یہ نظر آتی ہے ۔ کہ فارسی شاعروں میں سب سے زیادہ جس شاعر
نے انہیں متاثر کیا وہ سعدی ہیں ۔ انہیں سعدی سے ایک خاص لگاؤ اور
گہری دلچسپی ہے ۔ سعدی کی شخصیت اور اس سے بھی زیادہ ان کے ادبی
کارناموں نے حالی کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا ۔ سعدی نے اپنے قلم سے
اخلاقی اصلاح کا کام لیا تھا ۔ اور حالی طبعاً اس چیز سے بہت متاثر ہوئے ۔ حالی
کے اپنے کلام پر سعدی کا اثر کافی پایا جاتا ہے ۔ شاید اسی وجہ سے لوگ ان
کو "سعدی ہند" کہنے لگے ۔ لیکن سعدی اور حالی کے ہاں ایک نمایاں فرق
ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ سعدی مصلح ضرور تھے مگر ان کے ہاں شاعر
اور آرٹسٹ کا رنگ بہر حال غالب رہتا ہے ۔ خاص طور پر ان کی نثر
ان کی نظم سے بھی زیادہ دلکش اور حسین ہوتی ہے ۔ حالی بھی مصلح ہیں ۔
لیکن برخلاف سعدی کے اُن کے کلام میں اکثر جگہ ناصح اور مصلح کا رنگ غالب
آجاتا ہے ۔

اس کتاب میں حالی نے شیخ سعدی کے بچپن اور جوانی کے حالات
بڑے دلچسپ اور دل نشیں انداز میں بیان کئے ہیں اور ان کی زندگی کے
مختلف دوروں اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے ۔ دوسرے حصے
میں شیخ سعدی کے کلام کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے اور اُن کا موازنہ
دوسرے شعراء سے کر کے ان کی برتری ثابت کی ہے ۔ ان کی نظم و
نثر کی خوبیاں اور صناعیاں بڑی وضاحت سے نمایاں کی ہیں ۔ اور
اُن کی تصنیفات کی اصلاحی اور اخلاقی قدروں پر بہت زور دیا ہے ۔
حیات سعدی کا یہ حصہ پڑھیے جس میں حالی نے سعدی کی
دونوں مشہور عالم کتابوں گلستان اور بوستان پر تبصرہ کیا ہے ۔

"ان دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا خلاصہ اور لبِ لباب سمجھنا چاہیئے۔ ظاہرا فارسی زبان میں کوئی کتاب ان سے زیادہ مقبول اور مطبوع خاص وعام نہیں ہوئی۔ ایران، ترکستان، تاتار، افغانستان، اور ہندوستان میں ان کتابوں کی تعلیم ساڑھے چھ سو برس سے برابر جاری ہے۔ بچپن میں ان کی تعلیم شروع ہوتی اور بڑھاپے تک مطالعے کا شوق رہتا ہے۔ لاکھوں اُستادوں نے انہیں پڑھایا اور کروڑوں شاگردوں نے انہیں پڑھا۔ ان کے بے شمار نسخے خوش نویسوں کے قلم سے لکھے گئے اور بے انتہا اڈیشن لوہے اور پتھر پر چھاپے گئے۔ مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے۔ مشائخ اور علماء نے اُن کی عزت کی بادشاہوں نے ان کو سلطنت کا دارالعمل بنایا۔ منشیوں اور شاعروں نے ان کی فصاحت و بلاغت کے آگے سر جھکایا اور ان کے تتبع سے عاجز رہنے کا اقرار کیا۔ ان کا نام جس طرح ایشیا میں مشہور ہے۔ اسی طرح یورپ میں بھی عزت سے لیا جاتا ہے"

اگرچہ یہ دونوں کتابیں حسنِ قبول، فصاحت، بلاغت، تہذیب اخلاق، پند و نصیحت اور اکثر خوبیوں کے لحاظ سے باہم دگر ایسی مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینی مشکل ہے۔ بلکہ ان پر عربی کا یہ مقولہ صادق آتا ہے اَحَدُھُمَا اَفضَلُ مِنَ الاٰخَرِ لیکن اگر بعض وجوہ سے گلستاں کو بوستاں پر ترجیح دی جائے تو کچھ بے جا نہیں۔

فارسی نظم میں بوستاں کے سوا اور بھی ایسی کتابیں موجود ہیں جو بوستاں سے کم مقبول نہیں سمجھی گئیں۔ بلکہ مثنوی معنوی اور شاہنامہ نے

شاید اُس سے بھی بڑھ کر مقبولیت حاصل کی ہے۔ لیکن فارسی نثر میں ظاہرا کوئی کتاب شیخ سے پہلے اور اس کے بعد ایسی نہیں لکھی گئی جو گلستاں کے برابر مقبول ہوئی ہو۔ سر گور اوسلی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سعدی کی گلستاں کا ترجمہ جو کہ مشہور فاضل جنیٹس نے لاطینی میں کیا تھا۔ اس نے مدتوں یورپ کے اہلِ علم حضرات کو شیخ کے خیالات پر فریفتہ رکھا ہے۔

تذکرہ مجمع الفصحا جو کہ ایران میں تالیف ہوا ہے' اس میں یا کسی اور تذکرے میں لکھا ہے کہ فارسی نظم و نثر میں جس قدر چار کتابیں ایران میں مقبول ہوئی ہیں ایسی اور کوئی کتاب نہیں ہوئی۔ شاہ نامہ، مثنوی معنوی' گلستاں اور دیوانِ حافظ۔

ہندوستان میں بھی یہ چاروں کتابیں ایسی ہی مقبول ہوئی ہیں جیسی ایران میں مگر سب کی شہرت اور قبولیت کے وجوہ مختلف ہیں۔ اگرچہ ایک خوبی یعنی بیان کی سادگی اور بے ساختگی میں چاروں کتابیں کم و بیش مشترک ہیں اور یہ وہ خوبی ہے جس کے بغیر کوئی کتاب مقبول نہیں ہو سکتی۔ لیکن صرف اس قدر خوبی سے کوئی کتاب ایسی شہرت اور قبولیت کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کے ساتھ کوئی اور دلکش اور دل فریب چیز نہ ہو۔ کیونکہ نظم و نثر کی بیسیوں کتابیں جو تکلّف اور تصنّع سے بالکل پاک ہیں' ایسی بھی ہیں جن کا کوئی نام نہیں جانتا......

.....گلستاں کی عظمت اور بزرگی زیادہ تر اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر غیر زبانوں کا لباس اس کتاب کو پہنایا گیا ہے۔ ایسا فارسی زبان کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔ خود شیخ ہی کے زمانے میں گلستاں کے اکثر قطعات و ابیات اس قدر مقبول اور زبانوں پر جاری

ہو گئے تھے۔ کہ اس زمانے کے فضلاء اور اُدباء اس کے اکثر اشعار عربی نظم میں ترجمہ کرکے اپنا زورِ طبع اور قدرتِ زبان دکھاتے تھے ...."

(حیاتِ سعدی)

یادگارِ غالب

حالی کی دوسری سوانح عمری یادگارِ غالب ہے۔ غالب حالی کے مربی اور دوست تھے اور حالی ان کی سیرت اور شخصیت سے بہت متاثر اور ان کے کلام کے حسن و خوبی اور عظمت کے دل سے قائل تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ زمانے کا مذاق گرا ہوا ہے۔ غالب کے مقابلے میں دوسرے گھٹیا شاعروں کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ اور غالب کو مشکل پسند، مہمل گو وغیرہ سمجھا جاتا ہے اور چند بامذاق حضرات کو چھوڑ کر عام طور پر لوگ غالب کے کلام کی خوبی اور عظمت سے ناواقف ہیں۔ یادگارِ غالب لکھنے سے حالی کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو ان کے کلام کا صحیح مقام اور اس کی خوبیاں اور خصوصیات سمجھائیں اور اس طرح اُن کا مذاقِ شعر سنواریں۔ اور ساتھ ہی غالب کی سیرت اور حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیں۔ حالی نے اس میں بھی واقعاتِ زندگی پر زیادہ زور نہیں دیا۔ کتاب کا صرف چوتھائی حصہ سوانح حیات سے متعلق ہے۔ لیکن اگرچہ انہوں نے حالاتِ زندگی زیادہ تفصیل سے نہیں دکھائے پھر بھی اُن چند صفحات ہی میں غالب کی دلکش اور دلچسپ شخصیت کا ایسا نقشہ کھینچا ہے۔ کہ بے اختیار پڑھنے والے کے دل میں ان کی محبت اور احترام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ غالب کی شرافت اور وضعداری، سخاوت، سیرچشمی، ان کی ظرافت، خوش مزاجی، ان کی مشکلات و مصائب، ان کی طبیعت کی افتاد، ہر چیز اس خوبی سے دکھائی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود اس تاجدارِ سخن کے دربار میں موجود اس کی صحبت

سے لطف اُٹھا رہے ہیں۔

پہلے حصّے کے اختصار کی کسر حالی نے دوسرے میں نکال دی اس میں نہایت تفصیل سے غالب کے کلام کی خصوصیّات، ان کے اشعار کے مطالب، طرزِ بیان کی خوبیاں اور ندرتیں اور زبان کی نزاکتیں اور جدّتیں بیان کی گئی ہیں۔ یادگارِ غالب کے ذریعے حالی نے نہ صرف غالب کے اشعار سمجھنے کا گر سمجھایا اور غالب کے کلام کی اہمیت اور اس کا بلند مقام بتایا اور ان کی شخصیت اور کلام کی ترجمانی کی، بلکہ سچ پوچھیے تو بہت کچھ ملک کا مذاقِ شعر ہی بدل دیا۔ آج جو ہم ہر کسی کو غالب کے اشعار پڑھتے اور جھومتے دیکھتے ہیں یہ حالی ہی کی بدولت ہے۔ آلِ احمد سرور نے صحیح لکھا ہے کہ "غالب کی شاعری اپنے زمانے میں خواص تک محدود رہی۔ عوام تک اُسے پہنچانے اور غالب کی عظمت کا نقش ہر دل میں بٹھانے میں یادگار کا بڑا حصّہ ہے۔ ان کی تنقید کی سب سے خصوصیّت اعتدال ہے۔ وہ نہ بجنوری کی طرح غالب کو آسمان پر بٹھا دیتے ہیں اور نہ لطیف کی طرح ان پر بے آہنگی کا الزام لگاتے ہیں۔ انہوں نے غالب کی جو خصوصیات گنائی ہیں وہ تمام نقادوں حتیٰ کہ اکرام کا بھی فیصلہ ہے کہ غالب کی سب سے زیادہ منصفانہ تنقید یادگار میں ملتی ہے۔ انہوں نے غالب کے مشکل اشعار کی شرح کر کے غالب کی ترجمانی کا حق بھی ادا کیا ہے۔ اور فارسی کے بعض شعرا سے ان کا موازنہ یک طرفہ نہیں بلکہ انصاف پر مبنی ہے .... "خود حالی نے یادگار کے دیباچے میں لکھا ہے

"اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری اور انشاپردازی کے سوا نظر نہیں آتا مگر صرف اسی ایک کام نے ان کی لائف کو دارالخلافہ

کے آخری دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا اور اردو نظم و نثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے اس لئے کبھی کبھی مجھے اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے حالات جس قدر معتبر ذریعے سے معلوم ہو سکیں اور ابنائے زماں کے فہم سے بالاتر نہ ہوں ان کو اپنے سلیقے کے موافق قلمبند کروں"۔

حالی کے بعد غالب پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، اُن کے کلام کی کئی شرحیں شائع ہوئیں لیکن ان سب کی بنیاد یادگارِ غالب پر رکھی گئی ہے اور اسی سے سب نے خوشہ چینی کی ہے۔

یادگارِ غالب کی زبان اور طرزِ بیان حالی کی اور کتابوں سے زیادہ دلکش اور دل نشیں ہے۔ سیرت کی تینوں تصانیف میں یہ کتاب سب سے زیادہ مقبول ہوئی ہے اور اس مقبولیت میں خود غالب کی دلکش شخصیت کو بھی یقیناً دخل ہے۔ لیکن اس کا اندازِ بیان بھی ایسا ہے کہ ایک دفعہ کتاب ہاتھ میں لے کر بغیر پورا کئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ہے اور غالب کے منتخب اشعار کے معنی سمجھانے میں تو حالی نے کمال ہی کر دیا ہے۔

نمونے کے طور پر یہاں یادگارِ غالب کا ایک باب کا کچھ حصہ دیا جاتا ہے جس میں انہوں نے غالب کے مذاقِ شعر اور ان کے کلام پر بحث کی ہے۔

"یہاں یہ امر جتا دینا ضرور ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا بلکہ محض تفننِ طبع کے طور پر کبھی دوستوں کی فرمائش سے اور کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل کے لئے ایک آدھ غزل لکھ لیتے

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اُردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف بقدر معتدبہ نہیں پائی جاتی۔ وہ منشی نبی بخش کو ایک خط میں لکھتے ہیں "بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں، یہ غزلیں کاہے کو ہیں پیٹ پالنے کی باتیں ہیں، میرے فارسی قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا۔ اب قدر دانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہے گاہے حضرت ظلِ سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے۔ یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں"؛

قطع نظر اس کے وہ زمانے کے خیالات کے مطابق اردو شاعری کو داخلِ کمالات نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس میں اپنی کسرِ شان جانتے تھے۔ چنانچہ ایک فارسی قطعہ جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس میں شیخ ابراہیم ذوقؔ کی طرف خطاب ہے، کہتے ہیں ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگِ من است
راست میگویم من واز راست سر نتواں کشید
ہرچہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من است

مگر چونکہ مرزا کے معاصرین اکثر نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے اس لئے وہ ریختہ کے سر انجام کرنے میں بھی اپنی پوری توجہ اور اہمیت صرف کرتے تھے اور دونوں زبانوں میں اپنی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کی برابر فکر رکھتے تھے.........

مرزا کے اُردو کلام میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے غزل کے سوا

کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بمقابلہ بعض شعراء کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں۔ اور جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں نکلیں گے اُس قدر کسی ریختہ کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے۔ البتہ ہم کو مرزا کے عمدہ اشعار کو جانچنے کے لئے ایک جداگانہ معیار مقرّر کرنا پڑے گا.........

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مرگیا ہوں مرد افگنِ عشق کا ساقی، یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے، یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا اس لئے اُس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے۔ مگر زیادہ غور کرنے کے بعد، جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ ہی ساقی کے صلا کے الفاظ ہیں۔ اور اسی مصرعے کو وہ مکرّر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے کہ "کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق" یعنی کوئی ہے جو مے مردِ افگن عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرعے کو مایوسی کے لہجے میں مکرّر پڑھتا ہے کہ

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق

اس میں لہجے اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرعے مذکور کی تکرار کروگے فوراً معنی ذہن نشین ہوجائیں گے۔"

(یادگارِ غالب)

حیاتِ جاوید

ایک ہزار صفحے کی یہ ضخیم کتاب جو ۱۹۰۱ء میں سرسیّد کے انتقال کے بعد شائع ہوئی، حالیؔ کی سات سال کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے۔ وہ اُسے کئی سال سے مرتّب کر رہے تھے لیکن نہ انھوں نے کبھی سرسیّد کو دکھائی اور نہ سرسیّد نے دیکھنے کی خواہش کی۔ جب سرسیّد کا انتقال ہو گیا تو حالیؔ کو اس بات کا بڑا قلق ہوا کہ انھوں نے اس کا مسودہ سرسیّد کو کیوں نہ دکھایا تاکہ انھیں اندازہ ہوتا کہ ان کے بارے میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ سرسیّد کی وفات کے بعد مولانا حالیؔ اور بھی تندہی سے اس کی تکمیل میں مشغول ہو گئے تاکہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں اُن کے محسن کی سیرت جلد سے جلد پہنچے اور وہ اس سے سبق لے سکیں۔ لیکن وہ اتنی جلدی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ کام خراب ہو جائے۔ اپنے ایک خط میں خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں۔ کہ لوگ ہر طرف سے اصرار کر رہے ہیں کہ دو تین مہینے کے اندر اندر کتاب مکمل کر دو۔ مگر "میں ہرگز کسی کی نہیں سنوں گا اور جب تک میرے حسبِ دلخواہ سرسیّد کی لائف مکمل نہ ہو گی اُس وقت اس کا شائع ہونا نہ چاہوں گا۔ عربی میں ایک مثل ہے کہ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کام کتنی دیر میں ہوا بلکہ سب یہ دیکھتے ہیں کہ کام کیسا ہوا۔ لوگ اس بات کا لالچ دیتے ہیں کہ جس قدر جلد لائف تیار ہو گی اُسی قدر کثرت سے فروخت ہو گی۔ مگر اس بات کی مجھے مطلق پروا نہیں۔ لائف عمدہ طور پر لکھی

جائے اگرچہ اس کی ایک جلد بھی فروخت نہ ہو" یہ ہے ایک سچّے فن کار کا نقطۂ نظر۔

یہ خط اپریل ۱۸۹۸ء کا ہے۔ دو سال بعد مارچ ۱۹۰۱ء میں حیاتِ جاوید چھپ کر تیار ہوئی۔ تو مولانا حالیؔ نے اپنے بیٹے کو خط میں لکھا "خدا کا شکر ہے کہ یہ فرض ادا ہو گیا اور یہ کہنے کی کسی کو گنجائش نہ رہی کہ جس شخص نے قوم کی ایسی خدمات کیں قوم میں کسی کو اس کی لائف لکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔"

اگرچہ اس سے پہلے حالی سیرت کی دو کتابیں لکھ چکے تھے۔ مگر اس کتاب کے لکھنے میں انہوں نے جو ڈھنگ اختیار کیا اور جو اصول ان کے پیش نظر تھے اس کی تشریح کے لئے حیاتِ جاوید کے دیباچہ کا تھوڑا سا اقتباس پڑھیے۔

"ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے اس میں جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اوّل تو ایسی بایوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اس کے سوا وہ انہیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنہوں نے اس موج خیز اور پُر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے۔ ان کو سب نے بھلا جانا کیوں کہ ان کو کسی کی برائی سے سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں رستہ نہیں بھولے کیوں کہ انہوں نے اگلی بھیڑوں کی لیکھ سے کہیں اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو

اس کتاب میں اُس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصّب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے' بڑے بڑے علمائے مفسرّین کو للتاڑا ہے۔ اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے' قوم کے پکّے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں۔ جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے۔ اور جس کو پالٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے راست باز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جاسکتی ہے؟ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھونک بجاکر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر پر نکتہ چینی کی بنیا دڈالی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اُس کی لائف سے اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیا جائے۔"

سرسیّد سے حالی کی عقیدت کی بڑی وجہ اُس بلند مقصد اور قومی خدمت سے ان کی محبت تھی' جو سرسیّد کے پیشِ نظر تھا۔ حالی سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی رہ نمائی اور اصلاح کا جو حق سرسیّد نے ادا کیا اور جس طرح اپنی پوری زندگی قومی خدمت میں بسر کی وہ ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم سرسیّد کے عظیم الشان کاموں اور پُرخلوص خدمات کو حقیقت اور صداقت کی روشنی میں دیکھے اور اس سے سبق لے اور قومی رہنما ان کی سیرت اور کارناموں سے سیکھیں کہ قوم کی خدمت کیسے کی جاتی ہے۔ لیکن ان کا منشا محض سرسیّد کے "فضائل و مناقب بیان کرنا اور" مدلّل مداحی" نہیں تھا جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے۔

حالی نے پوری ایمان داری اور صداقت کے ساتھ سر سیّد کی خوبیاں اور کمزوریاں دکھائی ہیں اور ان کے کاموں کو تنقیدی نظر سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انسان کو اپنے عزیز یا دوست کی کمزوریاں ذرا مدھم اور خوبیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس لیے اگر حیاتِ جاوید میں سر سیّد کی تعریف کا پہلو ضرورت سے زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے تو مقامِ تعجب نہیں۔ جہاں تک عمداً "مدلل مداحی" کا سوال ہے حالی کی تمام ادبی زندگی اور سیرت کی داخلی شہادت اس کے خلاف ہے۔ حالی نے علمی دنیا اور عملی زندگی دونوں میں عمر بھر دیانت داری، انصاف پسندی اور صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس لئے یہ کسی طرح قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ انہوں نے سر سیّد کے لئے جو لکھا اس میں حقیقت کی طرف پوری توجہ نہیں کی۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھئے کہ حالی پچیس سال تک سر سیّد کے نہایت قریبی دوست رہے تھے اور انہوں نے ان کی سیرت اور شخصیت کو قریب سے دیکھا اور ان کے کاموں میں ان کا ساتھ دیا اور ہاتھ بٹایا تھا۔ سر سیّد کے مقاصد اور اُن کی صفات اور ان کے نقطۂ نظر کو جس طرح وہ سمجھ سکتے تھے دوسروں کے لئے مشکل تھا۔ کسی انسان کی سیرت اور کاموں کو ٹھیک ٹھیک وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اس کے ساتھ کافی وقت گزارا ہو اور خلوت و جلوت میں اس کا ساتھ دیا ہو۔ حالی سر سیّد کے دوست، رفیق کار، معتقد اور پرانے ساتھی تھے۔ اس لئے ان کی سیرت اور کارناموں سے قوم کو روشناس کرانے کا حق حالی سے زیادہ اور کس کو ہو سکتا تھا؟ چنانچہ انہوں نے حیاتِ جاوید میں سر سیّد کی

ایک مکمل اور جامع تصویر دکھائی اور مورّخ و نقاد دونوں کے فرائض کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر انہوں نے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سرسیّد کی زندگی اور کاموں کو دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس کتاب میں سرسیّد ساتھ ساتھ قوم کی ذہنی زندگی کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بقول آلِ احمد سرور "اس میں صرف سرسیّد کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ذہنی تاریخ آگئی ہے۔ حالؔی نے تمام مواد کو سمیٹنے اور مرتب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی ہے۔ ان کا یہ خیال کہ سرسیّد کے تمام کارناموں کا محرّک مذہبی اصلاح کا جذبہ تھا، بالکل صحیح ہے۔ اور انہوں نے سرسیّد کی مذہبی خدمات پر بجا طور زور دیا ہے۔ سوانح عمری میں سب سے ضروری چیز وہ ہمدردی ہے جس کے بغیر سوانح نگار ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا۔ حالؔی کے ہاں یہ چیز موجود ہے اور اسی وجہ سے ان کی کتاب کو "مدلّل مداحی" یا "کتاب المناقب" اور ایک رُخی تصویر کہا گیا۔ حالانکہ سوانح نگاری میں یہ سنگِ راہ کا کام دیتی ہے"

حیاتِ جاوید کی زبان اور طرزِ بیان بہت رواں اور سُلجھا ہوا ہے۔ باتوں باتوں میں بڑے بڑے مشکل مسائل پانی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کہیں ذہن اٹکتا ہے نہ دماغ ٹھوکر کھاتا ہے۔ ان کے ایک نقاد نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "حیاتِ جاوید میں تو انہوں نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہادیئے ہیں اور ہر لفظ نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہے جو اپنی جگہ سے اٹھایا نہیں جا سکتا۔..."

لیکن ان سب خوبیوں کے باوجود اگرچہ حیاتِ جاوید نے شہرت تو بہت پائی

لیکن پھر بھی اُسے اتنی مقبولیت نہ حاصل ہو سکی جتنی حالی کی بعض دوسری تصانیف کو ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ نظر آتی ہے کہ قوم کے ناشروں اور کتب فروشوں نے شروع سے اس سے بے اعتنائی ہوتی۔ اس قدر قابلِ قدر اور نتیجہ خیز کتاب کے مقابلے میں، جس کی قدر صرف صاحبِ ذوق اور علم دوست حضرات ہی کر سکتے تھے، انہوں نے زیادہ بکنے والی کتابوں کی اشاعت میں روپیہ لگانا پسند کیا۔ اور اس لیئے کتاب کی اتنی اشاعت نہ ہو سکی جتنی ہونی چاہیئے تھی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آج کل کا زمانہ بڑی تیز رفتاری کا ہے لوگوں کی مصروفیات حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں، ہر کام میں عجلت اور ہر چیز میں اختصار پسند کیا جانے لگا ہے۔ ناولوں کی جگہ مختصر افسانوں نے لے لی ہے۔ کتابوں کی جگہ اُن کے خلاصے پسند کیئے جاتے ہیں...... اس لیئے ہزار صفحے کی یہ ضخیم کتاب پڑھنا لوگوں کے لیئے مشکل ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس کا ایک اچھا خلاصہ تیار کر کے شائع کیا جائے تو وہ یقیناً مقبول ہوگا۔

شاید ایک اور وجہ یہ بھی ہو کہ سر سیّد کے بعد ان کی طرف سے غلط فہمیاں پھیل گئیں۔ لوگ سر سیّد کے اصلی مقصد کو سمجھنے سے قاصر رہے اور ان کی شخصیّت سے انہیں زیادہ دلچسپی نہ پیدا ہو سکی۔ اس لیئے ان کی سیرت کو پڑھنے اور ان کے کارناموں کو سمجھنے کی زیادہ طلب نہ رہی۔ نئے زمانے میں ایک گروہ یعنی ترقی پسندوں نے سر سید کو انگریزی حکومت کا خیر خواہ اور ساتھی سمجھ کر ناقابلِ اعتنا جانا۔ دوسرے گروہ یعنی رجعت پسندوں نے ان کی وقتی مصلحت کو ان کا اصول زندگی قرار دے کر ان کی تصویر میں اپنے رنگ بھر دیئے یعنی ان کو پورا ابن الوقت بنا دیا۔ حالانکہ اگر حیاتِ جاوید کا غور سے مطالعہ کیا جاتا تو ان دونوں فریقوں کی غلط فہمی دور ہو جاتی اور سر سید کا مقصد اور مشن آئینہ ہو جاتا ہے

میرا خیال ہے کہ سرسید کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں اُس کو دور کرنے کی ایک یہی صورت ہے کہ کوئی صاحبِ نظر مورخ اور ادیب حیاتِ جاوید کا خلاصہ مرتب کر کے شائع کرے۔ اس طرح ایک طرف سر سیّد کی سیرت سے قوم روشناس ہوگی، دوسری طرف حالیؔ کی یہ ادبی اور قومی محنت سوارت ہوگی۔ اور یہ انمول کتاب جو آج کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہے قبولیت کا وہ درجہ پالے گی جس کی وہ حقدار ہے۔

حیاتِ جاوید کا ایک اقتباس پڑھیے جس میں حالیؔ نے سر سیّد کی ترقی کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔

"سر سیّد کی لائف میں جیسا کہ ان کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے، بہت سی ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر اُن کی ترقیات کی بنیاد قائم کی جاسکتی ہے۔ قطع نظر اُن جسمانی اور اخلاقی قابلیتوں کے جن کے بخشنے میں قدرت نے بہت بڑی فیاضی کی تھی اور جن کے بغیر کوئی شخص بڑا آدمی نہیں ہوسکتا، اتفاقاتِ حسنہ نے بھی ان کے ساتھ کچھ کم مساعدت نہیں کی۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم خاندان کی نیکیاں اور نئے خاندان کی اولوالعزمی اور ہمتِ مجتمع تھی۔ اُن کی ددھیال سلطنت کے ایک قدیم متوسل گھرانے کی یادگار تھی اور ان کی ننھیال ایک ایسے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت، حسنِ تدبیر اور علم و فضل سے اپنے اقران و امثال میں امتیاز حاصل کیا تھا اور اپنے تئیں زمانے کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ خوش قسمتی سے بچپن میں زیادہ تر اپنی ننھیال ہی میں رہے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ انہوں نے اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے لایق ماموؤں کی صحبت میں ان کی ماں ایک نیک نہاد، سنجیدہ اور دانش مند بی بی تھیں،

جن کی تعلیم و تادیب سرسیّد جیسے جوہر قابل کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی تھی۔ انہوں نے حسنِ اتفاق سے ایسی حالت میں نشو و نما پائی کہ نہ ان کی حد سے زیادہ روک ٹوک ہوئی اور نہ ان کو بالکل مطلق العنان چھوڑا گیا۔ وہ پڑھتے لکھتے بھی تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے۔ مگر اپنے رشتے داروں کے سوا غیر جنس کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے۔ نہ ان پر تعلیم کا ایسا بوجھ ڈالا گیا کہ قوائے جسمانی مضمحل ہو جائیں اور نہ اُن کی ڈور ایسی ڈھیلی چھوڑی گئی کہ جدھر منہ اُٹھ گیا چل نکلے۔

اُن کے والد ایک آزاد منش اور تعلقاتِ دنیوی سے الگ تھلگ رہنے والے آدمی تھے۔ گھر کے انتظام اور اولاد کی پرورش اور تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا جو باوجود طنطنہ اور رعب وداب کے نہایت متحمل اور بُردبار تھیں۔ پس وہ بے جا تشدّد اور سختی جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے زمانے میں اکثر والدین سے ظہور میں آتی ہے اور جس سے رفتہ رفتہ اولاد کے دل میں خود اپنی حقارت اور ذلّت بیٹھ جاتی ہے سرسیّد پر کبھی نہیں گذری۔ جوانی کے آغاز میں سرسیّد کو بچپن کی نسبت کسی قدر زیادہ آزادی حاصل ہوئی۔ وہ اکثر رنگین جلسوں میں شریک ہونے لگے اور شہر کے نوجوان امیرزادوں سے ملنے جلنے لگے۔ سوسائٹی کا پرچھاواں اُن پر بھی پڑا اور پڑنا چاہیئے تھا مگر ہونہار نوجوانوں کی لغزشیں بھی ان کی اصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ایک ٹھوکر کھا کر ایسے چوکنا ہو جاتے ہیں کہ پھر عمر بھر ٹھوکر نہیں کھاتے۔ بھائی کی عبرت انگیز موت سے دل پر ایسی افسردگی چھائی کہ ہمیشہ کیلئے لہو و لعب سے دستبردار ہونا پڑا۔ مگر چونکہ طبیعت میں آتشگیر مادہ بھرا ہوا تھا وہ آخرکار مشتعل ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہی سودا جو عنفوانِ شباب میں ہوا و ہوس کی شکل

میں ظاہر ہوا تھا بیس برس بعد حُبِ قومی کے لباس میں جلوہ گر ہوا اور میر کا یہ شعر سرسید کے حال پر منطبق ہو گیا ؎

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

جس حد تک کہ سرسید کی تعلیم ہوئی اس کو بھی ان کی ترقی کا موید سمجھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے جیسا کہ پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے، قدیم یا جدید کسی طریقے میں پوری تعلیم نہیں پائی۔ اگر وہ پرانے طریقے کی تعلیم پوری کر لیتے اور علومِ قدیمہ کا رنگ ان پر پوری طرح چڑھ جاتا، پھر ممکن نہ تھا کہ کسی دوسرے رنگ کو قبول کرنے کی قابلیت اُن میں باقی رہتی۔ وہ تقلید کی بندشوں میں جکڑ جاتے اور تعصب کے تو بر تو پردے ان کی آنکھوں پر پڑ جاتے۔ نئے طریقے کی تعلیم بھی ان نتائج تک پہنچانے والی نہ تھی جو سرسید سے ظہور میں آئے۔ یورپ کی اعلیٰ درجے کی سویلزیشن اور حیرت انگیز ترقیات جو ایک ہندوستانی طالب علم کے دل پر تعلیم کے ساتھ نقش ہوتی جاتی ہیں وہ آخر کار اُس کو اپنے ملک کی ترقی سے مایوس کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ان کوششوں کو جو ہندوستانیوں کی ترقی اور اصلاح کے لئے کی جاتی ہیں محض بے سود اور لاحاصل جاننے لگتا ہے۔ پس کہا جاسکتا ہے کہ سرسید کا پرانی تعلیم میں ادھورا رہنا اور نئی تعلیم سے آشنا نہ ہونا منجملہ ان اتفاقاتِ حسنہ کے تھا جنہوں نے قوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام پر ہاتھ ڈالنے سے اُنہیں جھجکنے نہیں دیا۔

(حیاتِ جاوید)

مقدمہ شعر و شاعری یہ کتاب حالی کی نثر کی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور، سب سے زیادہ معتوب اور سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے۔ حالی نے ۱۸۹۳ء میں جب اپنی قدیم اور جدید غزلوں اور متفرق کلام کا مجموعہ اس مبسوط مقدمہ کے ساتھ شائع کیا تو ہر طرف سے شورِ تحسین اور غوغائے مخالفت بلند ہوا۔ لکھنؤ اسکول کے تو آگ ہی لگ گئی کیونکہ اس مقدمے نے فنِ تنقید کی جو نئی راہ نکالی تھی اس کی کسوٹی پر کسے جانے کے بعد اُس زمانے کے بیشتر شعرا کا کلام نِکمّا ثابت ہوتا تھا۔ حالی سے پہلے شعر کو عروض کی کسوٹی پر کسنا، اُس کے لفظوں، ترکیبوں، اور محاوروں پر اساتذہ کی سند لانا اور تذکیر و تانیث کی بحثوں میں اُلجھنا ہی شعر کی تنقید سمجھا جاتا تھا۔ حالی نے اس راہ کو چھوڑ کر شعر کے بنیادی اصولوں سے بحث کی کہ شاعری کا اصل مقصد کیا ہے اور اردو شاعری اُسے کہاں تک پورا کرتی ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں کہ "یہ مقدمہ اُن کے حسنِ ذوق اور وسعتِ نظر اور جدّتِ خیال کا آئینہ ہے۔ جب کوئی غیر شاعر شعر کی تنقید پر قلم اُٹھاتا ہے تو عموماً منطقی بحثوں میں پڑ کر اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے مگر حالی خود شاعر ہیں۔ اس لئے انہوں نے اصولی مسائل کے ساتھ ساتھ فن کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھا اور سمجھایا ہے۔ اردو میں حالی سے پہلے شعر کی تنقید کے معنی صرف یہ سمجھے جاتے تھے کہ لفظوں اور ترکیبوں کو اساتذہ کے کلام کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیں۔ حالی ہی نے پہلے پہل یہ بحث چھیڑی کہ شاعری کی روح کیا ہے اور وہ شعر میں کیسے پیدا ہوتی ہے......"

اس مقدمے میں انہوں نے غزل، مثنوی، قصیدے، مرثیے وغیرہ پر الگ الگ اور مفصل بحث کی اور ان سب پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ ان کی ضرورت، ان کا صحیح مقام سمجھایا ہے اور بتایا ہے کہ ان سے کیسے اور کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اصلیت، سادگی اور جوش کو شعر کی کسوٹی بنایا اور اس پر مختلف اشعار کو کس کر دیکھا اور دکھایا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ کامیاب شعر میں ان تینوں صفتوں کا موجود ہونا ناگزیر ہے۔ وہ غزل پر کڑی تنقید کرتے ہیں مگر دراصل وہ اس کے مخالف نہیں بلکہ اُس رنگ کے خلاف ہیں جو متاخرین نے غزل کا کر دیا تھا۔ آلِ احمد سرور کا خیال ہے کہ "ان کا اعتراض لکھنؤ اسکول پر ہے جس نے شاعری کو غزل میں اور غزل کو رعایتِ لفظی اور نازک خیالی میں محدود کر دیا۔ انہوں نے قدما کی اس وجہ سے تعریف کی ہے کہ وہ الفاظ کے طلسم سے نہیں بلکہ دل کی بات سُنا کر انسان کو مسحور کرتے ہیں۔ قصیدے سے چونکہ مبالغہ، جھوٹ اور خوشامد کی عادتوں کی ترقی ہوتی ہے اور ان سے قوموں میں ضعف پیدا ہوتا ہے اس لئے حالی اس کی مذمت کرتے ہیں۔ اور مرثیہ اور مثنوی نے چونکہ اُردو شاعری میں رزمیہ اور بزمیہ دونوں رنگ پیدا کیے اس لئے انہیں سراہتے ہیں۔۔۔۔۔"

حالی نے حکیمانہ انداز اور فلسفیانہ نظر سے شعر کی اصلی اور بنیادی صفات پر مفصل اور مدلل بحث کر کے یہ ثابت کیا کہ شاعری کا مقصد محض لفظوں سے کھیلنا اور خیالی طلسم بنانا نہیں بلکہ اس سے بہت بلند و برتر ہے۔ شعر کا کام سچے واردات قلب کو اس طرح بیان کرنا ہے کہ وہ سننے والے کے دل میں اتر جائے اور وہ بے اختیار پکار اُٹھے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا　　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اور شعر کا کام قوم کو اصلاح کی طرف متوجہ کرنا اور اس کو پستی سے نکال کر ترقی کی راہ پر ڈالنا' اس میں اچھا ذوق اور اچھے کام کی قدر پیدا کرنا بھی ہے۔ انہوں نے ثبوت میں بہت سے مغربی اور مشرقی شاعروں کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

دیوانِ حالی کے دیباچہ میں ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے "نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مراد نہیں ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں یا کسی کے ذہن تک ان کی رسائی نہ ہو سکے۔ بلکہ ایسے خیالات مراد ہیں جو شاعر و ناشاعر کے دل میں ہمیشہ گزرتے رہیں اور ہر وقت ان کے پیشِ نظر ہیں مگر اس وجہ سے کہ وہ ایسے پامال اور مبتذل ہیں ان کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور ان کی طرف بہت کم التفات کیا گیا اور پایہ شاعری کو ان سے وراءالوراء سمجھا گیا۔ لیکن فی الحقیقت شاعری کا بھید انہیں مبتذل خیالات میں چھپا ہوا ہے جو بسبب غایت ظہور کے لوگوں کی نظر سے مخفی تھا۔

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر — پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

پھر آگے چل کر کہتے ہیں... "الغرض جب سے شاعری کی لے کھلی معمولی شکار چھوڑ کر عنقا کی گھات میں بیٹھنا اور زمین پر ساگ پات کے ہوتے آسمان سے نزول مائدہ کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ زمانے کے حالات دیکھ کر جو کیفیتیں نفس پر طاری ہوتی رہیں اور جن واقعات کے سننے سے دل پر چوٹ لگتی رہی ان کو وقتاً فوقتاً اپنے سلیقے کے موافق شعر کا لباس پہناتے رہے....."

یہی نئی یا ترقی پسند شاعری کی بنیاد تھی جو حالی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ مگر حالی پرانی عمارت کے مسالے سے نئی عمارت کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ ان کا اصول یہ نہیں تھا کہ سرے سے عمارت کو ڈھا کر کہیں اور سے ایک نئی چیز

بنا کر لا کھڑی کی جائے۔ در اصل حالی اور اقبال کی کامیابی اور مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کو زبان اور بیان پر پوری قدرت تھی اور ساتھ ہی شعر و ادب کے سارے پرانے ذخیرے پر ان کو عبور حاصل تھا۔ قدیم شعرا کا سارا سرمایہ اُن کا کھنگالا ہوا تھا۔ اور پرانی تشبیہیں، استعارے، تلمیحیں اور الفاظ نئے خیالات کو ادا کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ چونکہ ان سے سننے والوں کے کان مانوس تھے اس لئے وہ انہیں آسانی سے قبول کر سکتے تھے۔ حالی خود کہتے ہیں "جب کسی ملک، یا قوم، یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آجاتا ہے مگر پہیہ اور دُھرا بدستور باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیئے تھے۔ مگر اسلوب بیان میں مطلق فرق نہیں آیا۔ جو تشبیہیں استعارے پہلے مدح، ہجا، غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے۔ وہی اب توحید، مناجات، اخلاق اور موعظت میں استعمال ہونے لگے۔ خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ متاخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات کی پیروی سے دست بردار ہو جائیں مگر ان کے طریقۂ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کسی غیر ملک میں نئے وارد ہونے والے سیاح کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ملک میں روشناس ہونے اور اہلِ ملک کے دل میں جگہ کرنے کے لئے اُسی ملک کی زبان میں گفتگو کرنی سیکھے اور اپنی وضع، صورت اور لباس کی اجنبیت کو زبان کے اتحاد سے بالکل زائل کر دے اسی طرح نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرز بیان میں قدما کے طرز بیان سے بہت دور نہ جا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انھیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں

کے کان مانوس ہوں اور قدما کا دل سے شکر گزار ہو جو اس کے لئے ایسے منجھے ہوئے الفاظ و محاورات اور تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔" حالی میں اور موجودہ دور کے نئے شعرا میں یہ ایک بہت بڑا فرق ہے۔ اگر جدید زمانے کے شاعر حالی کے اس مشورے پر عمل کرتے اور شعر کی قبولیت کے اِس گُر کو سمجھ جاتے اور ساتھ ہی قدما کے کلام پر عبور بھی حاصل کرتے تو انہیں اُس سے کہیں زیادہ قبولیت اور کامیابی حاصل ہوتی جتنی ہوئی ہے۔

اس مقدمہ میں حالی نے شعر کی ضرورت اور تاثیر کو تو ضرور تسلیم کیا ہے لیکن اس میں انہوں نے زیادہ تر شعر کی اخلاقی اور سماجی حیثیت پر نظر ڈالی ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ چونکہ پہلے صرف شعر کے جمالیاتی پہلو کو اہمیت دی جاتی اور اُسی پہلو سے بحث کی جاتی تھی اس لئے ردِ عمل کے طور پر حالی نے جو نظریہ پیش کیا اُس میں انہوں نے شعر کے افادی اور اخلاقی پہلو ہی پر زور دیا۔ اور اس کے جمالیاتی عنصر کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن کوئی بحث اور کوئی نظریہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اُس کا ہر پہلو اُجاگر نہ کیا جائے۔ مقدمہ میں یہ کمی بہت کھٹکتی ہے اور اس بنا پر جو اعتراض کئے گئے ہیں وہ ایک حد تک صحیح ہیں۔

حالی کے کلام اور اُن کی تصنیفات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ایک بات کا مجھے بار بار احساس ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ حالی حقیقت میں تو شاعر تھے... شاعر کی ساری خصوصیات اُن میں موجود تھیں۔ لیکن چونکہ بچپن سے اُن کی تعلیم و تربیت مذہبی ڈھنگ سے ہوئی تھی اور اخلاقی اقدار کی اہمیت دل میں بٹھائی اور ہر چیز کے افادی پہلو کو دیکھنے کی عادت ڈالی گئی تھی اس لئے وہ شاعر کے ساتھ ساتھ مصلح بن گئے۔ زندگی بھر شاعر اور مصلح میں کشمکش ہوتی رہی۔

کبھی مصلح نے غلبہ پالیا کبھی شاعر نے۔ اور اسی شاعر و مصلح کی کشمکش نے حالی کو حالی بنایا۔ ..... ورنہ وہ یا تو محض ناصح مشفق اور زاہد خشک ہوتے یا صرف خوش بیان اور خوش گو شاعر۔ حالی کی تصویر میں "ایک معلّم" ایک نقاد، ایک مصلح قوم کے خدوخال بھی موجود ہیں لیکن دل کی کیفیت جو آنکھوں سے جھلکتی ہے صاف کہہ رہی ہے کہ یہ ایک شاعر کا چہرہ ہے۔"

آج کل بعض نقاد حالی کے مقدمہ کا موازنہ یورپین نقادوں کی کتابوں سے کر کے اُسے پست اور گھٹیا اور سطحی کتاب ثابت کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن یہ یورپ زدہ لوگ، جن کے ذہن مغرب کی غلامی میں گرفتار ہیں شاید اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ہر زبان کے ادب کی خصوصیات الگ ہوتی ہیں۔ خصوصاً مقدمہ جو اُردو میں اپنے رنگ کی تنقید کی پہلی کتاب ہے اُسے مغربی ادب کی کسوٹی پر کسنا کہاں تک جائز ہے؟ مقدمہ کے مصنف (اور اُس وقت کا اُردو ادب) انگریزی زبان سے ناواقف تھے مغربی لٹریچر پر بھی اُنہیں پورا عبور حاصل نہ تھا۔ انہوں نے مغربی ادب کی موٹی موٹی بنیادی صفات کو (بعض کتابوں کے ترجمے پڑھ کر) ضرور سمجھا تھا وہ اس پر خود عمل کرنے کی کوشش کرتے اور دوسروں کو وہ اصول سمجھاتے تھے مگر انہوں نے کہیں یہ دعوے نہیں کیا کہ وہ یورپ کے اعلےٰ پایہ کے نقادوں کے برابر یا اُن سے بڑھ کر ہیں۔ بلکہ حالی تو کسی بھی ایسے موقع پر اپنی نارسائی اور عجز کا اظہار کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ یہ کتاب بھی انہوں نے اپنی دوسری کتابوں طرح ادب میں جدید رنگ پھیلانے کی خاطر لکھی تھی۔ اور اس لئے یہ کتاب تنقید میں سنگِ بنیاد کی حیثیت

ؔ مضامین عابد

رکھتی ہے۔ دوسرے اس پر بلند سے بلند عمارت تعمیر کر سکتے ہیں لیکن عمارت کی بلندی یا شان و شوکت کی وجہ سے کیا بنیادی پتھر کی ضرورت اور اہمیت کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

مقدمہ شعر و شاعری کا اندازِ بیان مدلل، رواں، دلچسپ اور پُر اثر ہے۔ عبارت میں سادگی، سلاست اور روانی موجود ہے۔ معنی کی صحت، لہجے کی متانت اور علمی و ادبی نکات کو صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں بیان کرنا حالی کا حصہ ہے۔ اس کی زبان بھی حالی کی وہی مخصوص زبان ہے۔ جس میں ہندی اور اردو کے خوبصورت اور موزوں الفاظ کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں انگریزی کے کرخت اور بے جوڑ الفاظ نظر بٹو کی طرح آنکھوں میں کھٹکتے اور کانوں کو گراں گزرتے ہیں۔

بہر حال یہ بات بالکل مسلم ہے کہ مقدمہ شعر و شاعری جدید رنگ میں فنِ تنقید کی پہلی کتاب ہے جس نے اردو میں تنقید کا ایک نیا باب کھولا اور اپنے رنگ میں نہایت دلچسپ، مفید اور بے مثل ہے۔ آج تک اردو میں تنقید کی جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب "مقدمہ" کی مرہونِ منت ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری کا یہ حصہ غزل میں اخلاقی مضامین پڑھیے، اس سے حالی کے نقطۂ نظر کے سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

"شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں وہ گرمی پیدا نہیں ہو سکتی جو عشقیہ مضامین میں ہوتی ہے۔ جو اثر شوق و آرزو اور دردِ جدائی اور کاہشِ انتظار اور رشکِ اغیار کے بیان میں ہے وہ واعظانہ پند و نصیحت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بے شک اخلاقی مضامین کو موثر پیرائے میں بیان کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اور بلاشبہ غزل جس میں سوز و گداز نہ ہو اور بچہ چوچلیلا اور چونچال نہ ہو دونوں میں کچھ کشش اور گہرائی نہیں ہوتی۔ لیکن ہمارے معاصرین کے لئے سوز و گداز کا اس قدر

مسالہ موجود ہے جو صدیوں تک نہیں نبٹ سکتا۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج کل دنیا کا حال صاف اس درخت کا سا نظر آتا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں۔ تناور درخت زمین کی تمام طاقت چُوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے پودے جواُن کے گرد و پیش ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ پرانی قومیں جگہ خالی کرتی چلی جاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں۔ یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا بُرد کر کے رہ جائے گی۔ بلکہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ ارض پر پانی پھرتا نظر آتا ہے۔ اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اُس کی جزئیات کو بیان کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ کسی واقعہ کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا! کسی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا۔ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہوگا اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ بس! اب کچھ نہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ میٹریل غزل کے لئے کیا ہو سکتا ہے۔ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ عشق عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں۔ اب وہ وقت گیا۔ عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہو گئی۔ اب کالنگڑے اور بھاگ کا وقت نہیں رہا۔ اب جوگئے کی الاپ کا وقت ہے ؛

اس کے سوا بڑے بڑے استادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے بلکہ ساری غزل مضمون اوّل سے آخر تک ایک ہے۔ ایسی غزلیں اگر کوئی کہنی چاہے تو اُس میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں۔ مثلاً ہر موسم کی کیفیت، صبح اور شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، میلے تماشوں کی چہل پہل، قبرستان کا

سناٹا، سفر کی روئیداد، وطن کی دل بستگی اور اس قسم کی اور بہت سی باتیں غزل میں بہت خوبی سے بیان ہو سکتی ہیں۔

الغرض غزل کو باعتبار مضامین اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہیئے۔ شعر کی لوگوں کو ایسی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو اگر ہمیشہ طرح بہ طرح کے کھانے میسر نہ آئیں تو وہ تمام عمر ایک ہی کھانے پر قناعت کر سکتا ہے۔ لیکن شعر یا راگ میں جب تک تلوّن اور تنوّع نہ ہو اُن سے جی اکتا جاتا ہے۔ جو گویا صبح سے شام، رات اور دن بھیرویں ہی الاپے جائے اُس کا گانا اجیرن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے مضامین سنتے سنتے شعر سے نفرت ہو جاتی ہے۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس طرح شعر میں جدت پیدا کرنی اور ہمیشہ نئے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کرنی شاعر کا کمال ہے اسی طرح ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور متعدد اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمالِ شاعری میں داخل ہے لیکن جب ایک ہی مضمون ہمیشہ نئی صورت میں دکھایا جاتا ہے تو اس میں تازگی باقی نہیں رہتی۔ ہر مضمون کے چند محدود پہلو ہوتے ہیں۔ جب وہ تمام پہلو ہو چکتے ہیں تو اس مضمون میں تنوع کی گنجائش نہیں رہتی۔ اب بھی اگر اسی کو چھیڑتے چلے جائیں گے تو بجائے تنوع کے تکرار اور اعادہ ہونے لگے گا......

(مقدمہ شعر و شاعری)

Borrower's No.	Date Loaned	Borrower's No.	Date Loaned